بلوچ قوم 7

عورتوں کی تحریک

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی آف سائنسز محفوظ ہیں

ضابطہ

کتاب:	عورتوں کی تحریک
مصنف:	شاہ محمد مری
اشاعت:	2015ء
قیمت:	160 روپے

ملنے کا پتہ:

سنگت بک سینٹر

عظیم میڈیکل سینٹر

بالمقابل مری لیب، فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

فون: 0092-81-2843358

www.sangatacademy.net

www.facebook.com/sangatacademy

ندر

اُن لوگوں کے خلاف جدو جہد کرنے والوں کے نام
جو عورتوں کے حقوق کے نام پر عورتوں کو غریبوں کی
عمومی تحریک سے کاٹ کر اُنھیں محض مردوں سے
مقابلہ بازی کروانے کی سازش کرتے ہیں۔

فہرست

پیش لفظ	6
عورت تحریک، شروعات	9
یک زوجگی کی ابتدا	15
فیوڈل دور کی عورت	20
عورت، کیپٹلسٹ عہد میں	43
پڑوس کی تبدیلیوں کے اثرات	58
-افغانستان	
-ایران	
ضیاالحق کا عورت دشمنی کا عہد	73
روایات، تواہمات اور ریاست	87

موجودہ حالت 95
سیاسی پارٹیاں اور خواتین 98
حاصلِ بحث 105

پیش لفظ

عمومی انسانی مسائل و معاملات کے ساتھ ساتھ عورتوں کے کچھ مخصوص مسائل و معاملات ہیں، جنھیں کبھی عمومی انسانی معاملات کے ساتھ ملا کر چلا جاتا ہے اور کبھی کبھی (ترقی یافتہ سماجوں میں) عارضی طور پر الگ سے مرتب کر کے کوئی موومنٹ چلائی جاتی ہے۔

چوں کہ مردانہ بالادستی (بالخصوص فیوڈل اور ماقبل فیوڈل سماجوں) کا دورانیہ بہت طویل رہا، اس لیے تاریخ میں تمام ضعیف طبقات کی طرح عورتوں کی زندگی پہ بھی بہت کم بولا، لکھا اور فلمایا گیا ہے۔ تاریخ انسانی میں عورت بہت کم مذہبی پیشوا رہی۔ اس کی شاعری اور دیگر تخلیقی صلاحیتوں کو سامنے آنے نہ دیا گیا۔ بالخصوص عورتوں کی اُن تحریکوں اور شخصیات کے بارے میں تو مخاصمانہ رویہ رکھا گیا، جنھوں نے مروج میں کسی طرح کی تبدیلی کا کام کیا۔

سوویت یونین اپنے نعمت بھرے سوشلزم کو سہہ نہ سکا تو وہ بھسم ہو کر پوری انسانیت کو بے رحم ملٹی نیشنل کمپنیوں کے حوالے کر گیا۔ کارپوریٹ دنیا کے حوالے جہاں ہر ابلیسی چیز پر فنڈنگ کی جاتی ہے۔ عورتوں کی تحریک، کسانوں کی تحریک، مزدوروں کی تحریک حتیٰ کہ سیاسی پارٹیوں کو غیر سیاسی بنانے کے لیے فنڈنگ ....نتیجہ یہ ہے کہ ہر ملک میں آپ کو مندرجہ بالا تنظیمیں زبردست دفاتر، گاڑیوں، اور کمپیوٹروں سے تو بھری ملیں گی مگر وہاں کے در و دیواروں کے دل و دماغ

سے سیاست ہٹا دی گئی۔اب یہ بے روح کے جسم ہیں جو عوام اور عوامی دھارے سے کٹ کر شیئرنگ،، لابنگ پر لگا دی گئی ہیں............عورتوں کی تنظیموں کا بھی یہی حشر کر دیا گیا ہے۔اس کی سانس کا اتار بھی فنڈڈ ہوتا ہے، سانس کا چڑھاؤ بھی آڈٹ شدہ۔

نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک نیا لفظ و اصطلاح ہمارے ذخیرۂ الفاظ میں گھس آیا: فیمنزم۔اور ظاہر ہے کہ یہ لفظ بھی بورژوا لفظ ہے۔عورتوں کے نام پر عورتوں کی فرقہ بازی۔سماج میں عورتوں کا فٹ بال کلب بنا کر مردوں کے فٹ بال کلب سے میچ کرواتے رہنا۔اس طرح بے شمار دیگر اصطلاحات میں ایک اور کا اضافہ کر کے ظالم و مظلوم، بالادست و محکوم اور امیر غریب طبقوں کی بنیادی لڑائی سے توجہ ہٹانے کا بندوبست کیا گیا۔

مردوں کی حاکمیت والی غیرت اور عقیدہ کی یک جہتی میں کوئی ضعف ابھی تک نہ آیا، روزگار کے مواقع اس کے لیے ابھی بھی نہیں ہیں، صنفی امتیاز اس قدر گہرا ہے کہ عورتوں کے خلاف امتیازی قوانین ابھی تک کروفر سے جاری ہیں۔تفریق ابھی تک جاری ہے۔اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی۔آبادی ابھی تک سرکار سردار کو نظر نہیں آتی، وہ اسمبلیوں میں 50 فیصد کی بجائے 16 فیصد نمائندگی کی تذلیل میں غلطاں ہے۔آدھی گواہی میں اور پانچویں حیثیت اسمبلیوں میں۔

چنانچہ ابھی وہ حسین ساعت نہیں آئی جہاں عورتوں کے لیے مساوی حقوق کے طرف دار اطمینان کا سانس لیں۔ابھی عبداللہ جان، عطا شاد اور اکرم دوست اپنی انسان دوست جدوجہد کو دوام دینے پر مجبور ہیں، ابھی وطن کی ''سمو'' فیوڈل سماج کے آہنی پنجرے میں بند ہے؛ اسے روشنی، ہوا اور حرکت کی آرزو ہے۔ابھی اس کا مست اس کی نجات کے لیے بے چین ہے، ابھی حاکم اڑیل ہے، ابھی تصادم کو دوام ہے اور ابھی ''منزل'' نہیں آئی۔

یاد رکھیے، عورتوں کی نجات............عمومی نجات ہے۔

مگر کتاب کے عنوان کے برعکس، معلوم انسانی تاریخ میں ایک خالصتاً عورتوں کی تحریک کبھی بھی موجود نہ رہی۔یہ تحریک ہمیشہ اپنے زمانے کی وسیع تر سماجی و سیاسی تحریکوں کی ساتھی رہی ہے۔یعنی مرد اور عورت دونوں پر مشتمل تحریک۔یہ شروع میں ہی واضح کرنا ضروری ہے کہ عورتوں کی

نجات غریب لوگوں کی تحریک اور جدوجہد کے ساتھ سختی کے ساتھ جڑی رہی ہے۔آج کل بہت سے لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر عورتوں کو ایک الگ تھلگ مخلوق قرار دے کر انھیں عمومی عوامی تحریک سے کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔یوں نہ صرف عورتوں کی نجات ناممکن ہو جاتی ہے، نہ صرف دیگر محکوم و مظلوم انسانوں کی تحریک کمزور ہوتی ہے بلکہ اس طرح کر کے، وہ پورا نظام برقرار رہتا ہے جس کو طبقاتی نظام کہا جاتا ہے اور جہاں عورتوں کی محکومی ایک لازمی عنصر کے بطور موجود رہتی ہے۔

جینوئن دانش ور عورتوں کی انسانی و معاشرتی حالت اور ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے درمیان اٹوٹ تعلق پر زور دیتے ہیں۔اس سے بیگمات اور صاحبات کی بورژوا عورت دوستی اور عوام الناس کی ''عورت نجات'' تحریک کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم ہو جائے گی۔یہ بہت ہی افضل کام ہے؛ کرتے رہنا چاہیے!!

شاہ محمد مری

ماوند

6 جولائی 2015

عورت تحریک؛شروعات

عورتوں کی تحریک کے لیے کسی ٹی وی، ریڈیو اور اخبار کی محتاجی کبھی نہ رہی۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان ذرائع سے عوامی تحریکوں کو کنفیوز کرنے، اور انتشار پھیلانے کا کام لیا جاتا ہے۔ تاریخ میں مادی ضرورتیں عورتوں کو اکٹھا کرتی رہیں۔ جہاں پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا اور ایک رائے قائم کی جاتی تھی۔ پانی بھرنے کے تالاب، کنوئیں اور نالے کے قریب کوئی چیز صیغۂ راز میں نہیں رکھ جاسکتی، تجارت سے متعلق خبریں، خاندانی بے وفائیوں سے متعلق، پڑوسیوں کے بیچ مسائل، حکمرانوں کی خاندانی اور ازدواجی زندگی سے متعلق...... سنجیدہ یا سطحی بحث ہوتی ہے، تبصرہ ہوتا ہے، تنقید ہوتی ہے یا تالیاں بجائی جاتی ہیں''۔(1)

عورتوں کی آزادی کی تحریک دراصل اُسی وقت سے شروع ہوئی تھی، جب سماج میں پہلی بار عورت اور مرد کے درمیان جنس کی بنیاد پر کام تقسیم ہوا تھا۔

جس وقت انسان جنگلوں کے اندر رہتا تھا، اور جب وہ درختوں پر سے زمین پر اتر آیا تو ظاہر ہے کہ پہلے پہل اُس نے چلنا تو شروع نہیں کیا تھا بلکہ وہ مینڈک کی طرح اچھل اچھل کر چلتا تھا۔ اس وقت وہ اپنی جنسِ مخالف کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اس کے کئی نظارے قدیم غاروں کی دیواروں پر کھدائی کے دوران دریافت شدہ قدیم، بھدے اور بدصورت بتوں اور بہت پرانے

قبائل کے رسوم و رواج میں نظر آتے ہیں۔ انسان کی یہ ساری معاشرت پسندی صرف اور صرف عورت، یعنی ماں کی وجہ سے رہی۔(2)

انسان ٹولیوں کی صورت میں بغیر گھر کے زندگی بسر کرتا تھا۔ خوراک کی تلاش اور موسموں کی شدت اُسے کہیں بھی ٹک کر رہنے نہ دیتی تھیں۔ وہیں عورت معزز ماں تھی۔ خوشی اور خوش حالی اُسی سے بندھی ہوئی تھی۔ وہ میوے جمع کرتی، فصل کاشت کرتی، پانی بھرتی، برتن بناتی، پوشاک تیار کرتی، باہر سے لایا ہوا شکار بانٹتی اور جھگڑوں کا تصفیہ کراتی تھی۔ چوں کہ وہ جمع کر کے ذخیرہ کرنے کا کام کرتی تھی، اس لیے عورت ہی نے ٹوکری، صندوق اور دیگچے وغیرہ بنائے۔ اسی نے آگ محفوظ کی۔(3)

چوں کہ سماج میں شادی وغیرہ کے ادارے ابھی قائم نہ ہوئے تھے، اس لیے وہ اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرنے اور اسے چھوڑ کر دوسرا شوہر کرنے میں آزاد اور خود مختار تھی۔ اس کی وارث اس کی بیٹی ہوتی تھی اور چوں کہ باپ کا پتہ نہ تھا، اس لیے ماں کی طرف سے نسل چلتی تھی۔ دورِ قدیم میں انسان آزاد جنسی معاشرہ میں رہتا تھا۔ اس لیے یہ ثابت کرنا کہ پیدا شدہ بچے کا باپ کون ہے، مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ لیکن چوں کہ فطری طور پر ماں کا علم ہوتا تھا، اس لیے سلسلہ نسب ماں سے چلتا تھا۔ عورت کا رتبہ قبیلوں کی سربراہ کا ہوتا تھا۔ جب شادی اور خاندان کے ادارے بنے تو بھی ابتدائی زمانوں میں شادی کے وقت رخصتی بھی مرد کی ہوتی تھی اور وہ اپنا قبیلہ چھوڑ کر ساس کے قبیلے میں چلا جاتا۔ اسی کے تسلسل میں ''گھر داماد'' کا رواج دنیا کی ساری قوموں میں آج بھی موجود ہے۔

مذہبی عقائد میں دیوتاؤں کی بہ نسبت دیویوں کا درجہ بڑا ہوتا تھا۔ یونانیوں کی بڑی دیوی ارٹیمز تھی۔ جو کہ بعد میں ڈیانا بنی، اور مسیحیت کے اندر اس نے حضرت مریم کی شکل اختیار کر لی۔(4) دجلہ اور فرات کے سومری اور کھادی دور کی دیوی کا نام ''نن ہورسگ'' تھا۔ عشتار'' ''اریش گل'' اور ''انانا'' بھی دیویوں کے نام تھے۔ مصریوں کی دیوی کا نام ''ازلیس'' تھا۔ ایرانیوں کی دیوی ''اناہیتا''۔ عربوں کی دیوی کا نام ''زہرہ'' اور ہندوستانیوں کی دیوی کا نام ''اوشا'' تھا۔ اس نظام کو

ماث واکی (مادرسری) نظام کہتے ہیں۔ یہ سماج بلوچوں کے بشمول ہر انسانی معاشرے نے اپنے ارتقا کے اولین مراحل میں بھگتا ہے۔قدیم تاریخ کے آثار وشواہد سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ابتدا میں قدیم معاشروں کے اندر مادرانہ نظام رائج تھا۔

بشریات، ارضیات اور سماجیات کے دانش وروں کا کہنا ہے کہ مادرسری نظام میں مرد، عورت کے تابع تھا۔ یہ نظام عراق، مصر، یونان، ایشیائے کوچک، قدیم ہندوستان، حتیٰ کہ بلوچستان کے مہرگڑھ میں ہزاروں سال تک رائج رہا۔ بلوچستان کے کئی علاقوں کے آثارِ قدیمہ میں عورتوں کے ایسے مجسمے ملے ہیں جن کو حاملہ دکھایا گیا ہے۔ جو سرسبزی، خوش حالی اور پیداوار کی نشاندہی کرتی ہے۔ مادرسری دور میں عورت معاشرے کی سب سے زیادہ متحرک اور فعال ذات تھی کہ جس نے تہذیب وتمدن کو آگے بڑھانے میں اپنی ذہانت اور صلاحیتوں کو استعمال کیا۔

عورت کے کارہائے نمایاں کو انسان کی قدیم ترین آبادی یعنی مہرگڑھ تہذیب وثقافت سے دریافت کیا جاسکتا ہے، جب عورت خوراک اندوزی کرتی تھی اور قبیلے کی سربراہ تھی۔خوراک اندوزی کے تجربے سے اس نے مختلف اقسام کے بیجوں کو زمین میں اُگا کر سبزیوں، پھلوں، دالوں اور غلے کو پیدا کیا اور زراعت کی بنیاد ڈالی۔مہرگڑھ سے برآمد ہونے والے غلے کے گودام اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ جو، جوار، باجرہ، گندم، کھجور، انگور اور کپاس کی کاشت مہرگڑھ میں شروع ہوئی۔ کپاس کو کات کر پارچہ بافی بھی عورت نے ایجاد کی۔جنگلی بھینس، گائے، بیل اور بھیڑ بکریاں بھی عورت کے ہاتھوں پالتو بنیں۔ گوشت اور غلے کو پکانے کے لئے آگ کو بھی عورت نے محفوظ بنایا۔پیش (اور کھجور) کے پتوں سے ٹوکریاں بُننا بھی عورت کی ایجاد ہے۔ کشیدہ کاری، زیورات کے خوب صورت نمونے بھی عورت کے تخیل کی تخلیق ہیں۔ نیز چاک کی ایجاد سے پہلے ہاتھ سے برتن بھی عورت ہی بنایا کرتی تھی۔

جدید حجری آلاتِ پیداوار میں ترقی، چاک کے برتنوں، کیمیا سازی اور آلات سازی نے عورت کے معاشرتی کردار کو محدود کر دیا اور قدیم اشترا کی مادرسری نظام کی جگہ غلام داری نظام نے لے لی تو عورت کی پہلی سماجی حیثیت تبدیل ہوگئی۔ مہرگڑھ دور سوم و چہارم میں دریافت ہونے

والی ہاتھ کی چکیاں عورت کی غلامی کو ظاہر کرتی ہیں، نیز مہرگڑھ دورِ دوم، سوم اور چہارم کے مدفنوں سے مُردوں کے ساتھ قیمتی زیورات اور ساز وسامان کی موجودگی اور بہت سے مدفنوں میں ان کی عدمِ موجودگی طبقاتی تفریق اور عورت کی غلامی کو واضح کرتی ہیں۔

مہرگڑھ، کلی گُل محمد، کلی فیض محمد اور بلوچستان کے کئی دیگر علاقوں سے مادرِارض کی وافر مقدار میں مورتیوں کی دریافت بھی عورت کی عظمت کو ظاہر کرتی ہے، جب عورت معاشرے میں مقتدر حیثیت سے وجود رکھتی تھی اور زرخیزی کی علامت اور پیداوار کا سمبل تصور کی جاتی تھی۔عورت کا یہی روپ ہماری مائیتھالوجی میں پاروتی، دُرگا، کالی اور مہادیوی کی صورت میں داخل ہوا۔اسی طرح بلوچ ہزار ہا سالوں سے بی بی نانی کے ساتھ اپنی عقیدت واحترام کا اظہار کرتے ہیں۔

ہنگلاج ہی کی طرح بولان میں مچھ کے قریب بی بی نانی کی زیارت بلوچوں کے لیے بہت اہمیت اور عقیدت واحترام کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ ہر دو مذکورہ مقامات دراصل ماقبل تاریخ کی مادرِارض کی باقیات ہیں۔

ہمارے ہاں اس نظام کو آریاؤں کی قسط وار آمد نے گڈ مڈ کر دیا تھا مگر رسوم ورواج میں اس کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔ برصغیر میں ہولی کا تہوار اُس زمانے کی یادگار ہے جب عورت' قبیلہ کی سردار ہوتی تھی۔اب وقت بدل جانے سے مردوں نے اس کی رسوم میں حصہ لینا شروع کیا۔مگر آج بھی جو مرد آگ کے گرد چلتا ہے، وہ زنانہ لباس پہنتا ہے۔ بنگلور میں ''موگا'' کے سالانہ تہوار کے وقت شریک پیشوا کو زنانہ کپڑے پہننے پڑتے ہیں(5)۔جناب سبط حسن نے اپنی کتاب ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'' کے صفحہ 71 میں لکھا: ''وادیِ سندھ میں 'اموی نظام' قائم تھا۔یعنی حسب نسب اور وراثت کا سلسلہ ماں کی طرف سے چلتا تھا۔لہٰذا معاشرہ میں عورت کا مرتبہ مرد سے اونچا تھا۔عورتوں کی مورتیوں کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کے باشندوں کے نزدیک عورت کی ذات افزائشِ نسل وفصل کی محرک بھی تھی اور علامت بھی۔ چنانچہ ان کے عقائد و رسوم 'مادرِارض' کے محور کے گرد گھومتے تھے۔''

آریہ نسل کو ایک بہت پرانی نسل ہونے کا درجہ حاصل ہے۔اس کی سب سے مقدس اور

قدیم کتاب ''رگ وید'' جوتقریباً تین ہزار سال قبل مسیح میں ترتیب دی گئی تھی؛ اس کتاب اور دیگر علمی تحقیق کے مطابق ہمارے اس پورے خطے میں ایک ہزار سال قبل مسیح تک ''مادری نظام'' جاری تھا۔ قدیم دستاویزات اور لسانی اعتبار سے یہ ثابت ہے کہ آریاؤں کا ''ساکا'' نامی قبیلہ آٹھویں یا ساتویں صدی قبل مسیح میں ہندوستان آیا تھا اور اس قبیلہ کی تہذیب اُن آریا قبائل سے بالکل جدا تھی جو بعد میں آئے اور ''ویدک'' کہلائے۔ اِن ''ساکاؤں'' کا سلسلۂ نسب ماں کی طرف سے چلتا تھا۔ اس لیے ان کی عورتیں ایک وقت میں کئی شوہر کرتی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں سات سو سال قبل مسیح تک آریا قبائل میں بھی ''مادری نظام'' پوری طرح جاری تھا۔(6)

اس نظام کی تفصیل باخونن کی کتاب ''مادری وطن''، مورگن کی کتاب ''قدیم سماج'' اور اینگلز کی کتاب ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' میں موجود ہے۔

حوالہ جات

1۔ پائلو کوئیلو، دی ففتھ ماؤنٹین، 1998، ہارپر کولنز پبلشرز، نیویارک، صفحہ نمبر 129

PP.66 ،Briffault, R."The mothers" Macmilla, New Yark۔2

3۔ گورڈن چائلڈ ''تاریخ میں کیا ہوا''، 1987، کراچی، صفحہ 70

4- برٹرینڈ رسل ''ہسٹری آف ویسٹرن فلاسفی''، 1991 لندن، صفحہ 26

5- کوسمبی، ڈی ڈی، ''قدیم ہندوستان کی ثقافت''، لاہور، صفحہ 71

6- سرکارزینی جارچوی ''مادر کائنات'' حصہ اول، 1993، شاہکار بک فاؤنڈیشن کراچی، صفحہ 109

یک زوجگی کی ابتدا

ایک طویل تاریخی عمل کے نتیجہ میں مادری نظام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ مادری نظام کی شکست سے پہلے ایک دور ایسا بھی آیا جب نت نئی ایجادوں کی بنا پر عورت و مرد کی ذمہ داریوں کی نوعیت تبدیل ہوگئی اور یوں معاشرتی ڈھانچے کی تبدیلی سے مردعورت کے تعلقات مساوی سطح پر آ گئے۔ تاہم یہ محدود عرصہ عورت مرد تعلقات کو اسی سطح پر برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔ ابتدائی زمانہ میں عورت کھرپے سے زمین کھود کر بیج بوتی تھی لیکن ہل کی ایجاد کے بعد جب اسے جانوروں کے ذریعے چلایا جانے لگا تو زراعت پر سے عورتوں کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ اسی طرح دھاتوں کے زمانہ میں انھیں پگھلانے کا کام مرد سرانجام دیتے تھے۔ چوں کہ دھاتوں سے اوزار وہتھیار بنانے کا کام اور انھیں استعمال کرنا بھی مرد کے حصے میں آیا، اس لیے مرد کی اہمیت میں یقیناً اضافہ ہوا۔ نئی ایجادات کی بنیاد پر جسمانی طاقت وقوت کا استعمال مرد کی برتری کا باعث بنا اور رفتہ رفتہ عورت کا سماجی مرتبہ گرتا گیا۔ زمین پر قبضے، جانور مویشی پالنے اور انھیں ذریعہ پیداوار کے طور پر استعمال کرنے سے ذاتی ملکیت کا آغاز ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ایک انسان اپنی ملکیت کس کے لیے چھوڑے؟ عورت تو ظاہر ہے اپنی اولاد کے لیے جسے وہ جانتی تھی، ملکیت چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن مرد بے خبر ہوتا تھا کہ اس کی اولاد

کون سی ہے، لہٰذا ضروری سمجھا گیا کہ اپنی اولاد سے باخبر رہا جائے۔ یہ صرف یک زوجگی کی صورت ہی میں ممکن تھا۔ ابتدا میں یک زوجگی مستقل نہیں بلکہ عارضی تھی لیکن جائیداد کی اہمیت کے پیش نظر جلد ہی مستقل یک زوجگی کا آغاز ہوا۔ یوں یک زوجگی، ذاتی ملکیت کی حفاظت اور اسے جائز وارثوں تک منتقل کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ بقول اینگلز: ''یک زوجگی خاندان کی وہ پہلی شکل تھی جس کی بنیاد قدرتی نہیں بلکہ اقتصادی حالات پر تھی اور یوں خاندان ایک اقتصادی اکائی بن گیا۔ یک زوجگی کے ساتھ ہی شادی شدہ یا ملکیت شدہ عورت کا دوسرے مرد سے تعلق رکھنا ناجائز اور گناہ قرار پایا۔ اس کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں مقرر کی گئیں۔ بلاشبہ یک زوجگی سماجی تاریخ میں ایک ترقی پسند تبدیلی کے طور پر سامنے آئی۔ خود عورتیں بھی اس کی حامی تھیں کیوں کہ اس سے انفرادی محبت کا تصور پیدا ہوا لیکن مرد کی اقتصادی مصلحتوں نے اس انفرادی محبت کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ نجی ملکیت کے ادارے کو محفوظ رکھنے اور اسے مضبوط بنانے کی خاطر شادیاں مصلحتوں اور مفادات کی نذر ہونے لگیں۔ ایسی شادیوں کا مقصد محض یہی رہ گیا تھا کہ کسی طرح سے جائیداد میں اضافہ کیا جائے اور خاندانی مراعات کا تحفظ کیا جائے۔ اصولی طور پر تو مرد کو بھی یک زوجگی کی پابندی کرنی چاہیے تھی لیکن ذاتی ملکیت کے تحفظ کے لیے عورت ہی کو پابند بنایا گیا۔ مرد کو ایک سے زائد عورتوں سے تعلقات قائم کرنے کا مکمل اختیار تھا۔ چوں کہ مردانہ معاشرہ اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ جس طرح مویشیوں سے گوشت، دودھ اور زرعی زمین سے فصل حاصل کی جاتی تھی۔ ایسے ہی عورت سے اولاد حاصل کی جانے لگی اور اس کی حیثیت انسان سے گر کر 'چیز' بن گئی۔ اسے ہم انسانی تاریخ کا پہلا طبقاتی ظلم بھی کہہ سکتے ہیں۔''

خوب صورت ''ماٹ وا کی نظام'' کی بربادی اُس وقت شروع ہوئی جب بہت سے قبیلوں نے خانہ بدوشی کی زندگانی ترک کر دی، اور زمین پر بس گئے۔ کاشت کاری گو کہ بہت ہی ادنیٰ قسم کی تھی مگر بیج بو کر فصل اگانے کی صلاحیت پیدا کر کے انسان نے خود اپنی طرز حیات کے تانے بانے بدل کر رکھ دیے۔ جوں جوں کاشت بڑھتی گئی، قابلِ کاشت زمین کی ضرورت بھی بڑھتی گئی۔ اب انسان بحیثیت لینڈ مافیا پانی والی زمینوں پر قبضہ کرتا گیا۔ ذاتی ملکیت کے لیے انفرادی

قوت کی عددی بڑھوتری قبائل کے لیے فیصلہ کن ہتھیار بن گئی۔ کثیر تعداد والا گروہ، کم تعداد والے گروہ کو کچل ڈالتا، ان کے شکار والے پالتو جانوروں اور زمین پر قبضہ کرتا اور ان کے افراد کے بچے کھچے لوگوں کو اپنا غلام بنالیتا............ یوں طبقاتی سماج وجود میں آ گیا۔

طبقاتی سماج قائم ہونے سے عورت کی مالی اہمیت کم ہوتی گئی، جس کے سبب اس کی حکمرانی اور اختیار بھی زوال پذیر ہوئے اور ساری طاقت مرد کے ہاتھ میں جمع ہوتی گئی۔ عورت کے نصیب اس وقت سو گئے جب غلام مزدوروں کا دور شروع ہوا۔ یہی وقت دراصل قدیم کمیونسٹ زندگی کے خاتمے اور طبقاتی نظام کے آغاز کا وقت تھا۔ اس طرح ذاتی ملکیت کا آغاز پہلے جانوروں سے ہوا جو کہ مردوں کی ملکیت تھے اور اس پراسیس نے بالآخر ''مادری نظام'' کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ اس دور کو ایک فلاسفر، کارل مارکس نے یوں بیان کیا؛ ''مادری حق کا خاتمہ عورتوں کی عالمی تاریخی شکست تھی۔ مرد نے گھر کے اندر بھی سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں مجتمع کر لیے۔ عورت اپنی افسری سے گر گئی، اس کے ہاتھ پاؤں بندھ گئے۔ وہ مردوں کی سہولت کی لونڈی بنا دی گئی اور محض بچے پیدا کرنے کا وسیلہ سمجھی جانے لگی۔'' بچے پیدا کرنے کے اس وسیلے کو افرادی قوت کا سرچشمہ گردانا گیا۔ اس لیے عورت (یا اس کی کوکھ) بھی قبیلے کا قیمتی اثاثہ یا ملکیت قرار دی گئی۔

مادری نظام میں مساوات تھی، زندگی کو تقدس حاصل تھا، انسان دوستی، روشن خیالی، جمہوریت اور اشتراکیت تھی۔ جب کہ پدرانہ معاشرے میں آمریت، مطلق العنانی، فاشزم اور انفرادیت پرستی کو فروغ حاصل ہوا۔ اس میں اِس ذہنیت کی جڑیں گہری ہوتی گئیں کہ جس فرد کا تعلق قبیلہ یا برادری سے نہ ہو' اُسے نفرت اور شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ انھی جذبات سے قوم پرستی اور نسل پرستی پیدا ہوئے۔(1)

جیسے کہ بتایا گیا کہ یک زوجگی کے تحت شادی کردہ یا ملکیت شدہ عورت کا کسی اور سے تعلقات استوار کرنا ناجائز اور گناہ ٹھہرا اور اس کے لیے سخت سزائیں مقرر ہوئیں۔(2) سردار، ایک بادشاہ نما عہدہ بن چکا تھا۔ اُسے ایک سے زیادہ عورتیں رکھنے کا اختیار حاصل ہو گیا۔ لونڈیاں، حرم سرائیں اور خواجہ سرائیں وجود میں آ گئے۔ زمین کے ساتھ زن بھی زحمت اور فساد کی جڑ قرار دی

گئی۔(3) دیوی مغلوب ہو گئی اور دیوتا کا نیا اور غالب ادارہ قائم ہوا۔ یعنی شروع کے معبود صنفِ نازک میں سے تھے، اب پٹ وا کی (پدرسری) نظام میں مذکر دیوتاؤں نے اُن کی جگہ لے لی۔(4)

غلام داری معاشرے کے زوال کے بعد عورت کی سماجی حیثیت مزید کم ہوئی۔ فیوڈل ازم میں تو سارا فلسفہ عورت کو نیچا دکھانے پر استوار ہوتا ہے۔ عورت ملکیت بن جاتی ہے۔ وہ اب صرف ''گھر والی'' رہ جاتی ہے۔ Familia لاطینی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے ''ایک مرد کے گھریلو غلام''، یعنی اس کی بیوی اور بچے۔ ایک امیر شخص کی کئی عورتیں ہوا کرتی تھیں اور غریب کی ایک بھی نہیں۔ جنسی فریضہ کی بجا آوری ہی اس کی ہستی کی بنیاد بنتا ہے۔ اور یہ جنسی تعلق بھی انتہائی بدصورت، کُھردرا اور جانوروں جیسا ہوتا ہے۔ جوں جوں معاشی رشتے فیوڈل ازم سے آگے والے سماج کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، یہ جنسی تعلق، محبت کا تعلق بنتا جاتا ہے۔ یہ تعلق غنی ہوتا جاتا ہے۔ اس حد تک کہ یہی جنسی رشتے معاشی رشتوں کو نئی گرمی اور نئی پیچیدگی عطا کرتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ بورژوا کلچر پُر جوش محبت رکھتا ہے اور اس سے پہلے والا فیوڈل کلچر رومانٹک' یا صنفِ نازک کے لیے بہادری والی محبت والا تھا اور اُس سے بھی قبل غلام داری (یونانی) کلچر خالص روحانی محبت (Platonic Love) رکھتا تھا۔

حوالہ جات

1-ایرک فرام ''صحت مند معاشرہ'' (اردو ترجمہ)، 1991، لاہور، صفحہ 51

2-اینگلز: خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز، ماسکو، صفحہ 91

3-جلالپوری، علی عباس، ''عام فکری مغالطے''، صفحہ 213

4-ول ڈیورانٹ / تنویر جہاں: ''انسانی تہذیب کا ارتقا'' مکتبہ فکر و دانش لاہور، 1989، صفحہ 97

فیوڈل دور کی عورت

غلام داری سماج کے بعد جاگیرداری نظام کے وجود میں آنے سے عورت کے استحصال میں پہلے ادوار کی نسبت کہیں اضافہ ہوگیا۔ یہ جاگیرداری نظام بلوچ میں چاکری عہد کے آخری زمانے میں شروع ہوا۔ جاگیرداری نظام نے عورت کو گھر تک محدود کیا۔ دنیا میں جاگیرداری دور ہی وہ تاریک دور ہے جس کے اندر معاشرے میں جسم فروشی کا منظّم آغاز ہوا۔ عورت کی سماجی مصروفیات پر پابندی لگا کر اُسے چار دیواری تک محدود کرنے سے عورت کا سماجی مقام مزید گرتا گیا۔ یونانی عہد میں مشہور یونانی قانون دان سولین کا قانون تھا کہ اگر کوئی عمل عورت کے زیر اثر کیا جائے تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہ ہوگی۔ رومن قانون تھا کہ عورت اپنے شوہر کی وفات کے بعد اس کی جائیداد کی وارث نہیں ہوسکتی۔

مگر، پدرانہ معاشرے کی سب سے زیادہ زبردست عکاسی یہودی مذہب کرتا ہے۔ وہاں کے 'احکامِ عشرہ' میں ایک حکم یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے اس طرح بات کرے جیسے آقا غلام سے اور بادشاہ رعیت سے کرتا ہے۔ شوہر کو یہ اختیار تھا کہ جب چاہتا بیوی کو طلاق دے سکتا تھا، مگر بیوی کو شوہر سے علیحدگی کا حق نہ تھا۔ اگر بیوی سے بے وفائی سرزد ہوتی تو یہ سخت ترین جرم تصور ہوتا۔ اگر اُس پر زنا ثابت ہوتا تو اسے سنگسار کیا جاتا تھا۔ اگر بچہ نہ ہوتا تو اس کی ساری ذمہ داری بیوی

پر آتی۔ باپ کو حق تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو فروخت کر دے۔ یہودی مرد کی یہ دعا ہوتی تھی کہ ''خدا تیرا شکر ہے کہ تم نے مجھے عورت نہیں بنایا''۔ یہودیت کے ہاں عورت گناہ کی طرف راغب کرتی تھی۔ یہودیوں کے ایک ربی نے عورتوں کے بارے میں کہا تھا کہ ''عورت کو خاموشی سے خدمت گاری سیکھنی چاہیے۔ اُسے نہ تو تعلیم دلانی ہے اور نہ شوہر پر حکم چلانا ہے۔ اس کی مغفرت صرف اس بات میں ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرے''۔(1)

یہودیوں کے عورت دشمن نظریات صرف انھی تک محدود نہ رہے بلکہ یہ تمام کے تمام اثرات تقریباً ساری قوموں پر پڑے اور ہر جگہ مندرجہ ذیل تصورات پختہ ہوتے گئے۔

* ....عورت مرد کی طفیلی ہستی ہے جو مرد کی تنہائی اور بوریت دور کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔
* ....عورت نے ہی مرد کو بہشت بہ در کروادیا۔
* ....عورت کی سرشت میں گناہ کا عنصر شامل ہے۔
* ....عورت کے ساتھ جنسی روابط بذات خود ایک ناپاک عمل ہے۔
* ....عورت مرد کی غلامی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

بعد میں یسوع مسیح پر ایمان لانے والے بھی چوں کہ یہودی تھے، لہٰذا عورت ذات کے بارے میں تحقیر آمیز نظریات انھوں نے اِس نئے اور ترقی یافتہ مذہب میں بھی شامل کر لیے۔

''عہد نامۂ قدیم'' کے دس فرمودات صرف اور صرف مرد سے مخاطب ہوتے ہیں۔ نویں فرمود میں عورت کا تذکرہ گھریلو ملازموں اور گھریلو جانوروں کے ساتھ کیا گیا۔

مسیحیت کے پادریوں کے ہاں عورت ناپاک ہے۔ وہ بہکانے والی ہے جو دنیا میں گناہ لے آئی۔ چنانچہ یسوع مسیح کے حواریوں اور چرچ کے پادریوں نے شادی کو ایک لازمی بدی جانا۔ ایک نے تو یہاں تک کہا کہ ''عورت، تم دوزخ کا دروازہ ہو''۔

مسیحیت میں پہلے سینٹ پال، پھر سینٹ آگسٹائن اور بعد میں سینٹ تامس اور دوسرے مذہبی پیشواؤں نے عورت کو بہت نیچ اور ذلیل قرار دیا۔ سینٹ پال نے کہا، ''مرد، عورت کے لیے پیدا

نہیں ہوا بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی ہے، لہٰذا عورتوں کو مردوں سے کمتر درجہ پر رہنا چاہیے''۔

سینٹ تامس آف اکینو (1227 تا 1274) کہتا ہے: ''عورت ایک تیز اُگنے والی گھاس پھوس ہے، ایک نامکمل ہستی۔ اس کا جسم زیادہ تیزی سے بلوغت تک پہنچتا ہے صرف اس لیے کہ اس کی کم اہمیت ہے، اور فطرت اس کے بنانے میں کم مصروف ہوتی ہے۔ عورت ابدی طور پر اپنے آقاؤں اور خاوندوں کے جوئے کے نیچے رہنے کے لیے پیدا کی گئی، فطرت نے اُسے ہر لحاظ سے بالادست کے لیے وقف کر دیا، اور لہٰذا یہ بات اس کی تقدیر میں ہے کہ اس پہ حکمرانی کی جائے''۔

بلاشبہ' عورت کو تاریخ میں چرچ نے جس قدر حقیر اور نیچ بنایا کسی اور ادارے نے نہ بنایا۔ صدیوں تک عورت کو بڑی بے دردی اور درندگی کے ساتھ ''ڈائن'' اور ''جادوگرنی'' کہہ کر زندہ آگ میں ڈال دیا گیا۔ بعد ازاں ایک انقلاب آیا۔ براؤنسٹ، بپٹسٹ یا کوئیکرز نامی فرقوں کی طرف سے مرد اور عورت کی روحانی برابری کی بات کی گئی۔ ایک مہیب اور گھناؤنی پستی کے پس منظر میں یہ اس قدر بڑا انقلابی قدم تھا کہ عورتوں کی بہت بڑی تعداد ان فرقوں میں شامل ہوگئی اور تندہی کے ساتھ علی الاعلان ان فرقوں کی تبلیغ شروع کر دی۔

البتہ پروٹسٹنٹ فرقہ میں شوہر اپنی بیوی کے لیے زمین پہ خدا کا درجہ رکھتا تھا۔ اس مجازی خدا کی رضامندی کے بغیر وہ تنکا بھی ہلا نہیں سکتی تھی۔ عورتوں کو گھریلو معاملات تک میں کسی قسم کا اختیار نہ تھا۔ شادی شدہ عورت نہ تو جائیداد رکھنے کی حقدار تھی، نہ اسے کسی کے ساتھ تجارتی لین دین کرنے کا حق حاصل تھا، اور نہ ہی وہ سیاست میں حصہ لے سکتی تھی۔

اسی طرح چرچ کے کار پردازوں نے عورت کی پسماندگی کو بڑھانے میں شد و مد سے حصہ لیا۔ انھوں نے عورت کے کردار کو سطحی، کمزور اور دماغی طور پر غیر مستقل مزاج قرار دیا۔

قرونِ وسطیٰ میں مردوں نے عورتوں پر برتری قائم کرنے کے لیے نہ صرف عورتوں کے سماجی کردار کو محدود کیا بلکہ انھیں رسمی تعلیم اور عام معلومات کے حصول سے بھی محروم کرنے کی کوشش کی۔ چرچ کی انھی تعلیمات کی وجہ سے یورپ میں جادوگرنیوں کی آڑ میں عورت کے خلاف زبردست مہم چلائی گئی اور دلیل یہ دی گئی کہ شیطان جب انسان کی شکل اختیار کرتا ہے تو وہ مکمل نہیں

ہوتا، وہ جسمانی نقائص کا حامل ہوتا ہے۔ چرچ کا خیال تھا کہ جسمانی طور پر نامکمل کیوں کہ عورت ہوتی ہے یا عورت مرد کی بگڑی ہوئی شکل ہوتی ہے، اس لیے وہی جادوگرنی ہوسکتی ہے، مرد نہیں۔ علاوہ ازیں کیوں کہ عورتوں کے جسم میں گناہ موجود رہتا ہے، اس لیے شیطان عورت کو جلد ورغلانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور عورت شیطان کی آلہ کار بننے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

چنانچہ جادوگرنیوں والی مہم کے نتیجے میں عورتوں کو زندہ جلایا گیا، قید تنہائی میں رکھا گیا اور پھانسی پر لٹایا گیا۔ انگلش لٹریچر میں جادوگرنیوں کا موضوع جسے متعدد شاعروں اور ادیبوں نے موضوعِ سخن بنایا، عیسائیت کے اسی کہنہ دور کی یاد دلاتا ہے۔

ڈائنوں کا جلا دینا مغربی تہذیب کی ایک خصوصیت ہے جو کہ، کبھی کبھار کی سیاسی استثناؤں کے ساتھ سولہویں صدی تک جاری رہی اور پھر کم ہوتی گئی۔ انگلینڈ میں ڈائنوں کے آخری جوڈیشل قتل میں، ایک عورت اور اس کی 9 سالہ بیٹی کو پھانسی دی گئی تھی۔ اُن کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے اپنے موزے جرابیں اتار کر ایک تیز بارش کرائی تھی۔(2)

انگلینڈ کے بادشاہ جیمز اول نے ڈائنوں پر ایک سریع الاعتقاد اور اوہام پرست کتاب لکھی۔ وہ بائبل کو انگلش میں عظیم ترجمہ کرنے کا سرپرست بھی تھا، جس پر ابھی تک اُس کا نام لکھا ہے۔ یہ خیال کنگ جیمز کا تھا کہ تمباکو ''شیطان کا پودا'' ہے، اور بے شمار ڈائنیں اسی دوائی کی عادی ہونے کے ذریعے سے دریافت کی گئیں۔(3)

یورپ میں تو ان ڈائنوں کو تلاش کر کر کے قتل کر دینا ایک عظیم فریضہ سمجھا جاتا تھا۔ مسیحی ملاؤں نے ڈائن عورتوں کو معاشرہ اور خدا کی دشمن قرار دیا ہوا تھا۔ اپنا جرم تسلیم کروانے اور اپنی گینگ کی دوسری ڈائن ساتھیوں کے نام بتانے کے لیے ان پر بدترین تشدد کیا جاتا تھا۔ یہ تشدد اس قدر گھناؤنا ہوا کرتا تھا کہ عورتیں مان جایا کرتی تھیں کہ وہ واقعی ڈائنیں ہیں۔ وہ شیطان کے ساتھ اپنی جنسی مباشرتوں کا احوال اس طرح بیان کرتی تھیں جس طرح کہ 1482 کے واقعات کو ''ناٹرڈم کے گرجا کے ذریعے ایمرالڈ نامی حسین دوشیزہ کو اذیتیں دے کر اس سے اگلوالیا گیا کہ ''وہ بدروحوں، بھوتوں، پریتوں اور جنوں سے جنسی تعلق رکھتی ہے، چڑیلوں کے تہواروں میں شریک ہوتی ہے اور

شیطان کی پجارن ہے''۔(4)

سولہویں اور 17 ویں صدی کے دوران پورے یورپ پر ''ڈائنوں کو سزا'' دینے کا خبط سوار ہوچکا تھا۔ اس زمانے کو "Witch hunt" کہتے ہیں۔ دراصل پندرہویں صدی کے اواخر تک کلیسا نے یورپ کو اس طرح عورتوں سے نفرت پر آمادہ کیا تھا کہ پہلے تو انفرادی صورت میں ڈائن ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کی جانے لگیں۔ پھر صورت حال اس قدر دھماکہ خیز ہوگئی کہ سولہویں صدی میں یہ خبط سکاٹ لینڈ، فرانس، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں بہت قبیح صورت اختیار کرگیا۔ یہ ایک علاقہ میں بھڑک اٹھتا اور پھر بہت ہی غیر فطری اچانک پن کے ساتھ ختم ہوجاتا۔

اس Witch کا نعم البدل بلوچی میں کہیں ''بھلی'' ہے اور کہیں ''جاتو''۔ اور بلوچ جاتو کی ایک خاص پہچان یہ بتائی جاتی ہے کہ واردات کے وقت اس کا اوپر کا اگلا دانت ٹوٹا ہوتا ہے۔ بلوچ تو اپنی ''جاتو'' اور ''بھلی'' سے خوب واقف بھی ہے اور اپنے اعمال سے روزانہ آدم کی پُرافتخار بیٹی کو درجنوں کے حساب سے ''جاتوؤں'' میں بدلتا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی اس کے بند سماج کا بہت ہی رازداری کا مظہر ہے۔ بلوچ اپنے ''ڈائن ساز'' معاشرے کو بہت ہی پُراسرار خاموشی کے ذریعے دوام بخشتا ہے۔ اس لیے آیئے ہم یورپ کی ''جاتو'' کو دیکھتے ہیں جو بہت ہی دلچسپ مگر دردناک مظہر رہا ہے سولائزیشن کے سفر میں۔

فریڈرک وان سپی نامی پادری کو ان لوگوں کے اعتراضات سننے کا موقع ملا جنھیں جرمنی کے شہر ورز برگ میں جادوگری کا مجرم ٹھہرایا گیا تھا۔ 1631 میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس میں معصوم لوگوں کے خلاف کلیسا اور ریاست کی زیادتیوں کا پردہ چاک کیا گیا تھا۔ پاکستان کی فیڈرل شریعت کورٹ یا کوئی مسیحی نظریاتی کونسل اس پادری کو یقیناً تباہ و برباد کرنے کی سزا دے دیتی مگر خدا بھلا کرے طاعون کے مرض کا جس نے اسے ریاستی پشت پناہی میں چلنے والے مذہبی اداروں کے ہاتھ میں جانے سے پہلے ہی ماردیا۔ آیئے کتاب کے اقتباسات دیکھتے ہیں:

''اچانک یوں ہوا کہ کیتھولک مسلک کے لوگوں کے درمیان تمام توہمات، سازشیں جادوگری کے خبط کو تقویت دینے میں جت گئیں۔ اس کے بعد خدا اور فطرت پس پردہ چلے گئے اور

اب ہر شئے کی ذمہ داری یہی جادوگرنیاں تھیں...........

''ہر طرف یہ شور بپا تھا کہ مجسٹریٹ، ''جادوگرنیوں'' کے مقدمات کی تحقیقات کر رہے ہیں جن کی تعداد میں صرف اس لیے مسلسل اضافہ ہوتا گیا کہ عوام اس میں دلچسپی لے رہے تھے۔مگر شہزادوں نے اپنے ججوں اور مشیروں کو خصوصی طور پر اس کام کے لیے متعین کیا کہ جادوگرنیوں کے خلاف مقدمات چلائیں۔مگر ججوں کو مطلق اندازہ نہ تھا کہ مقدمہ کیسے چلائیں کیوں کہ ان کے پاس کوئی گواہی یا کوئی ثبوت موجود نہیں ہوتا تھا۔

مقدمات میں التوا سے لوگوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے جن کے بارے میں مخبر، شہزادوں کو باقاعدہ اطلاع پہنچاتے رہے تھے۔جرمنی میں ان شہزادوں کے خلاف کوئی بات کرنا سنگین جرم تصور ہوتا تھا حتیٰ کہ مذہبی علما بھی ان کی منشا کے مطابق کام کرتے تھے۔''

چنانچہ ججوں نے عوامی خواہشات کے احترام میں مقدمات کا آغاز کیا۔بہت سے ایسے جج بھی تھے جو اس نازک معاملے میں جلد بازی سے ہچکچاتے تھے۔ان کی مدد کے لیے خاص سراغ رساں بھیجے گئے جنھیں حقیقتاً ایسے معاملات میں سراغ رسانی کا ذرہ برابر تجربہ نہیں تھا۔لیکن وہ جو کچھ تفتیش کرتے، اسے فیصلہ کرنے کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ان سراغ رسانوں کو تفتیش کرنے میں مالی فائدہ بھی ہوتا تھا۔خاص طور پر غریب اور لالچی لوگوں کے لیے یہ فائدہ بہت اہم تھا۔ہر جادو گرنی کے جلائے جانے پر انھیں خاص انعام ملتا تھا۔وہ ملزمان سے بھی رقم بٹورتے تھے۔کیوں کہ ان کے اخراجات ملزمان اور ان کے لواحقین پورے کرتے تھے۔

اگر کوئی پاگل کسی بے یارومددگار عورت کے بارے میں یہ کہہ دیتا کہ وہ جادوگرنی ہے تو اسے بلاتردد مان لیا جاتا۔

چونکہ عورت کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوتا تھا۔صرف افواہ کی بنیاد پر اس کو ملزم ٹھہرایا جاتا تھا، اس لیے اس سے جرح نہیں کی جاتی تھی۔فرض کر لیا جاتا تھا کہ یا تو اس عورت نے شیطانی زندگی گزاری ہے یا یہ ایک نیکوکار ہے۔اگر تو پہلی بات درست ہے تو پھر اسے مجرم ثابت کرنے کے لیے کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔لیکن اگر اس کے بارے میں نیکوکار ہونے کی شہادت ملتی تو

اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ اس کا ڈھونگ ہے۔جادوگرنیاں اکثر خود کو نیکوکار ثابت کرنے کے لیے بظاہر شریفانہ اطوار اپنا لیتی ہیں۔

عورت کو جیل میں بند کر دیا جاتا۔اس کے خلاف ایک نیا ثبوت یوں تلاش کیا جاتا کہ یا تو یہ خوفزدہ ہے یا مطمئن۔اگر تو وہ اردگرد کوٹھڑیوں میں دوسری جادوگرنیوں پر ہونے والے تشدد کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی ہے تو یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ خود بھی جادوگرنی ہے، اور یہ کہ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہے۔لیکن اگر وہ خوف زدہ نہیں ہوتی اور یوں ظاہر کرتی کہ اسے اپنی بے گناہی پر پورا یقین ہے تو یہ بات بھی اس کے خلاف جاتی تھی کہ جادوگرنیاں اکثر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے خود کو نڈر ظاہر کرتی ہیں۔

جس کسی کے دل میں عورت کے خلاف عداوت ہوتی اس کے لیے انتقام لینے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا کہ اس کے خلاف جو چاہے کہہ ڈالے، اسے مان لیا جائے گا۔ایسی عورت کے خلاف ہر کسی کی گواہی کو ٹھوس ثبوت کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔فوراً ہی عورت پر تشدد شروع کر دیا جاتا۔ان مقدمات میں ملزمہ کو وکیل کرنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔نہ کسی کو اس کی وکالت کرنے کی اجازت ملتی۔اور اگر کوئی ایسا کرنے کی کوشش کرتا تو دراصل جج صاحبان اور دوسرے لوگوں کو موقع دیتا کہ وہ اس پر عورت کے جرم میں برابر کا شریک ہونے کا الزام ثابت کر سکیں۔ایسے بہت سے افراد کو صرف اس لیے جادوگر کہہ کر سزا دی گئی کہ انھوں نے کسی جادوگرنی کی حمایت کی تھی۔

عورت کو عدالت میں پیش کیا جاتا۔اس کے خلاف ثبوت پڑھ کر سنائے جاتے اور سزا سنائی جاتی۔

اگر وہ الزامات کا جواب دیتی اور شواہد کو غلط قرار دیتی تو اس کے بیان پر کوئی توجہ نہ دی جاتی۔نہ اسے عدالتی کاروائی کی کتاب میں لکھا جاتا۔اسے واپس جیل بھیج دیا جاتا اور کہا جاتا کہ یہ ضدی عورت ہے اور اپنا جرم ماننے سے انکار کر رہی ہے۔اگلے روز اسے پھر عدالت میں پیش کیا جاتا اور اذیت دینے کی سزا کا اعلان ہوتا، جیسے اس نے واقعی اپنا جرم قبول کر لیا ہو۔

اذیت دینے سے پہلے اس کی جامہ تلاشی ہوتی تاکہ اگر کوئی تعویز وغیرہ کہیں چھپایا گیا ہو

تو چھین لیا جائے۔اس کے جسم کے تمام بال ترشوائے جاتے ۔اسے اذیت دینے کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ اپنے خلاف عائد کیئے گئے الزامات کو تسلیم کرے۔ چاہے وہ انھیں غلط ہی سمجھتی ہو۔

ابتدائی طور پر کم تکلیف دہ تشدد کیا جاتا۔اگر اس درجے پر عورت جرم کا اعتراف کر لیتی تو کہا جاتا کہ عورت نے بغیر تشدد کے ہی گناہ قبول کر لیا ہے۔ جب شہزادے کو بتایا جاتا کہ عورت نے تشدد کے بغیر ہی اپنا جرم قبول کر لیا ہے تو پھر شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہوگی۔لیکن اگر وہ اعتراف نہ کرتی تب بھی اسے تشدد کے ذریعے مار دیا جاتا۔کیوں کہ تشدد کے آغاز کا مطلب ہی یہ ہوتا تھا کہ اس کی سزائے موت کا آغاز ہو چکا ہے، جس کا اختتام اس کے جلائے جانے پر ہوتا۔اس کے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

وہ اعترافِ گناہ کرتی یا نہ کرتی، نتیجہ ایک ہی تھا۔اگر وہ اعتراف کرتی تو جرم واضح تھا جس کی سزا موت تھی۔ اگر وہ اعتراف نہ کرتی تو تشدد کو بتدریج سخت کیا جاتا تھا۔جس کا نتیجہ بھی موت تھا۔تشدد کے دوران اگر عورت اپنے حواس بحال رکھتی تو کہا جاتا یہ ہم پر ہنس رہی ہے۔اگر وہ بے ہوش ہو جاتی تو کہا جاتا یہ سو گئی ہے۔ یا اس نے چپ سادھ لی ہے۔چپ سادھ لینے کی سزا بھی ہوتی کہ اسے جلا دیا جائے۔ پادری اور کلیسا کے حکام بھی یہی خیال کرتے تھے کہ وہ اپنے کیے پر نادم نہیں ہے۔

اگر وہ تشدد کے باعث ہلاک ہو جاتی تو کہا جاتا شیطان نے اس کی گردن توڑ دی ہوگی۔تب اس کی لاش کو پھانسی کے تختے پر لٹا دیا جاتا۔

اس عورت کے لیے گنجائش نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنا دفاع کرے یا خود کو بے گناہ ثابت کر پائے۔ یہ تحقیقاتی کمیٹی کی توہین سمجھی جاتی تھی کہ اس نے ایک ایسی عورت کو گرفتار کیا، اس پہ مقدمہ چلایا، اور اس پہ تشدد کیا جو کہ مجرم نہیں تھی۔

جاہل اور کند ذہن پادری صاحبان مل کر اس عورت کو ہراساں کرنے کی کوشش کرتے تاکہ وہ جلد از جلد گناہ قبول کر لے۔ جب تک وہ ایسا نہ کرتی، اسے لعنت و ملامت کا سامنا کرنا ہوتا تھا۔

کچھ جج، عورت کو اعترافِ گناہ کروانے کے لیے جادو کے کاٹ کے ماہرین کے پاس

بھجواتے اور اس پر تشدد کا عمل تیز کر دیتے تاکہ وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آئے۔اگر وہ اعتراف نہ کرتی تو ظاہر ہے اسے جلا دینے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ بچتا۔ ذرا اندازہ کریں کہ جو عورت اعتراف کرتی ہے اور جو نہیں کرتی، دونوں کا انجام اگر ایک جیسا ہوتا ہے تو ایک بے گناہ کے لیے بچاؤ کا کون سا راستہ بچتا ہے؟

جب کوئی بدقسمت عورت تشدد برداشت نہ کرتے ہوئے گناہ کا اعتراف کر لیتی تو اس کی حالتِ زار قابلِ بیان ہوتی۔اس سے بہت سی عورتوں اور مردوں کے جرم کی بھی تصدیق کروائی جاتی جنھیں وہ جانتی بھی نہ ہوتی۔ جب کہ ان مجرموں سے اور بہت سے لوگوں کو مجرم ثابت کرنے کا کام لیا جاتا۔ وہ سب لوگ مل کر مزید بہت سے لوگوں کو مجرم قرار دیتے۔ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

اب ذرا ان مظالم پر غور کیجئے جو ان عورتوں پہ ڈھائے جاتے تھے۔اس حوالے سے روسل ہوپ رابنز کی کتاب ''جادوگری اور شیطانی علوم کا انسائیکلو پیڈیا'' 1959 خاصے کی چیز ہے۔ اقتباس ملاحظ ہو:

''بام برگ میں جادوگرنیوں کی اذیت رسائی کے لیے جو طریقے استعمال کیے جاتے، ان پر بھی ایک نظر دوڑا لیجیے؛ مثلاً ملزم کو ہیرنگ مچھلی کھلائی جاتی جو نمک میں پکی ہوتی۔ پھر اسے پانی کی سزا دی جاتی۔ملزم کو کھولتے ہوئے پانی میں جس میں لیموں کا عرق ملا ہوتا، ڈبویا جاتا۔ دوسری سزاؤں میں، مختلف قسم کے تختوں، گرم لوہے کی کرسی، چمڑے یا دھات کے ایسے لمبے جوتوں کی سزا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن میں ابلتا ہوا پانی یا پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جاتا تھا۔ پانی کے ذریعے دی جانے والی دوسری سزاؤں میں ایک یوں تھی کہ ملزم کے حلق میں پانی انڈیلا جاتا۔ ساتھ ہی نرم کپڑا بھی اندر گھسیڑا جاتا۔ جب وہ کافی اندر پہنچ جاتا تو اس کو سرے سے پکڑ کر تیزی سے باہر کھینچا جاتا تا کہ اندر آنتیں پھٹ جائیں۔ خاص طرح کے پلاس سے ہاتھ کے انگوٹھوں کو دبایا جاتا حتیٰ کہ وہ ناخنوں کی جڑوں تک سکڑ جاتے۔

جادوگری کے عوامی خبط کے مخالفین کی جرأت مندی، مراعات یافتہ طبقے کے اس خبط کی زد میں آ جانے کے خدشے، سرمایہ دارانہ نظام پر اس کے برے اثرات کے اندیشے اور خاص طور پر

یورپی خردافروزی کی تحریک کے فروغ کی وجہ سے جادوگرنیوں کو جلانے کا خبط اپنی موت آپ ہی مر گیا۔آخری بار 1610 میں جادوگری کے الزام میں ہالینڈ میں مقدمہ چلا۔جو خردافروزی کی تحریک کی جائے پیدائش تھا۔ایسا ہی آخری مقدمہ انگلستان میں 1684 ، امریکہ میں 1690 ، فرانس میں 1745 ، جرمنی میں 1775 اور پولینڈ میں 1793 میں سامنے آیا۔اٹلی میں مذہبی عدالت اٹھارویں صدی کے اواخر تک لوگوں کو موت کی سزائیں دیتی رہی۔کیتھولک کلیسا نے اس حوالے سے 1816 تک ملزموں کو اذیت رسانی کا عمل جاری رکھا۔''

دوسری جانب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے نام پر نئے نظریات اور تحریکیں اُٹھیں تاہم ان میں سے کسی نے بھی عورت کے سماجی مقام کو اونچا نہ کیا۔ہیومن ازم کی تحریک کا موضوع مرد تھا اور تھامس مور کی یوٹوپیا میں عورت کم حیثیت کی مالک ہے۔اسی طرح تحریکِ اصلاحِ مذہب میں عورت مزید پسماندہ ہو کر رہ گئی۔جہیز نہ دے سکنے کی وجہ سے بے شمار لڑکیاں نن (راہبہ) بن کر خانقاہوں میں جانے پر مجبور ہوگئیں۔لباس میں تبدیلی آئی تو مرد قبا و جبہ کی جگہ تنگ پتلون اور کوٹ پہننے لگا لیکن عورت قدیم لباس ہی میں لپٹی رہی۔سینٹ آگسٹائن کی کتاب ''شہرِ الٰہی'' جس کی تعلیمات کا اثر چرچ پر بہت زیادہ ہے، عورتوں کی زبردست مخالف ہے۔چرچ کے عہدے داروں پر کنوارے پن کی پابندیاں لگانے کی ابتدا اُسی نے کی تھی۔اس لیے کہ عورت کو برائی، گناہ اور خرابی کی علامت بنا کر ہی وہ تجرد کی مہم کو کامیاب بنا سکتا تھا۔چرچ کی جانب سے عورت کی نجی زندگی میں بھرپور مداخلت شروع ہوگئی۔مثلاً انھیں تنبیہ کی گئی کہ وہ زیادہ نہایا دھویا نہ کریں۔بننا سنورنا ان کے لیے ممنوع ہے۔ضروری نہیں کہ وہ کھیلوں میں حصہ لیں۔ان کی زندگی کا واحد مقصد خاندان کے معاشی استحکام کے لیے بچے پیدا کرنا ٹھہرا۔عورتوں سے نفرت کا اظہار چرچ کے 13 ویں صدی کے ایک عالم البرٹ دی گریٹ نے یوں کیا،''عورت مرد کے مقابلے میں اخلاقی طور پر کمتر ہے، چوں کہ اس میں مرد کی نسبت زیادہ سیال مادہ ہوتا ہے اور سیال مادے کی خصوصیت آسانی سے حرکت کرنا ہے۔ لہٰذا عورت کی فطرت میں غیر مستقل مزاجی پائی جاتی ہے۔عورت کے جذبات اُسے برائی کی جانب لے جاتے ہیں کیوں کہ وہ عقل سے عاری ہوتی ہے''۔

ہندومت میں بھی عورت کا مقام اعلیٰ و ارفع نہ تھا۔اگرچہ آثارِ قدیمہ کی شہادتوں اور مذہبی لٹریچر سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ بلوچستان میں ابتدائی معاشرے مادرانہ نظام کے حامل تھے جس کی شہادت موسیٰ خیل کے غاروں کی دیواروں پر عورت کی تصاویر اور مختلف دیگر مقامات سے برآمد ہونے والی دھرتی ماتا کی مورتیوں سے ملتی ہے۔لیکن آریاؤں کے آتے رہنے اور سماج کی اپنی بڑھوتری اور ارتقا سے بعد میں پدرانہ نظام اپنی حقیقی شکل میں قائم ہو چکا۔وہ دیویاں جن کی ابتدائی ادوار میں پوجا کی جاتی تھی ان کی جگہ اب دیوتا لے چکے تھے۔اگرچہ اوشا، ارن یانی اور سرسوتی، درگا اور پاروتی کی پوجا ہوتی تھی مگر ان کی وجہِ شہرت دل کشی و خوب صورتی تھی نہ کہ طاقت۔

بلوچستان میں مادرانہ نظام ایک دم ختم نہیں ہوا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ زوال پذیر ہوا۔اس لیے ان علاقوں میں جہاں ابتدا میں پدرانہ نظام رائج ہوا، وہاں مادرانہ نظام کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اسے فحش اور بے حیائی پر مبنی نظام قرار دیا۔

رام اور راونڑ دونوں، عورت کے لیے ہیرو نہ تھے، مہاتما بدھ یعنی ''لائٹ آف ایشیا'' کا اپنا دامن عورت کے لیے تیرہ و تاریک تھا۔وہ عورتوں کی موجودگی سے سخت بے چین ہوتا تھا۔وہ تو اپنے مذہب (بدھ ازم) میں بھی عورتوں کو ہانپ ہانپ کر قبول کرتا تھا۔بدھ کے چہیتے شاگرد آنندا نے ایک بار اس سے پوچھا:

''آقا، ہم عورتوں کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھیں؟''

مہاتما نے جواب دیا، ''آنندا، یوں سمجھو کہ تم انھیں دیکھ ہی نہیں رہے ہو''۔

''لیکن اگر ہمیں ان کی جانب دیکھنا پڑے تو پھر کیا کریں؟''

''تو اُن سے بات چیت نہ کرو، آنندا''۔

''مگر آقا، اگر اُن سے بات کرنی پڑے تو کیا کریں؟''

''تو پھر اپنے ایمان کی خیر مانگ، آنندا''۔(5)

آؤ ایک مزیدار بات سنو!۔ہمارا ایک تبلیغی دوست یورپ گیا، واپس جو آیا تو حال احوال میں بہت دکھ سے کہنے لگا،''ہمیں تو ہمارے سفر کے سربراہ کا حکم تھا کہ عورت سے بات کرتے

ہوئے اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھیں بلکہ آنکھیں نیچی رکھیں۔مگر یورپ میں مصیبت یہ تھی کہ میں کسی عورت سے بات کرتے ہوئے حسبِ عادت فوراً آنکھیں نیچی کر لیتا مگر وہاں تو اس کی ننگی ٹانگیں نظر آتی تھیں''۔

''تو پھر اپنے ایمان کی خیر مانگ، آنندا''۔

ہندوستان میں قانون کا سب سے پہلا تشریح کنندہ منو تھا۔اس کے مطابق اس زمانے میں قانونی طور پر بھی، عورت کا درجہ بہت بہت پست تھا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی محتاج اور دست نگر تھی .... باپ کی، شوہر کی، یا بیٹے کی۔قانون، عورت کو اک منقولہ جائیداد قرار دیتا تھا۔

ترکی میں عثمانی بادشاہوں نے تاریخ میں لونڈیوں کا سب سے بڑا حرم قائم کیا۔ ایک روایت کے مطابق یلدرم کی شکست کے بعد امیر تیمور نے اس کی بیگم کو دربار میں سرعام نچوایا۔ نتیجے کے طور پر عثمانی بادشاہوں نے شادی کرنی ترک کر دی تا کہ اُن کی ''عزت و ناموس'' محفوظ رہے۔ لہٰذا اُن کے حرم میں محض کنیزیں ہوتی تھیں جنھیں سلطنت کے انتظامی کارندے تحفے کے طور پر شاہی دربار میں پیش کر کے بادشاہ کے لطف و کرم سے فیض یاب ہوتے تھے۔لونڈیوں کی حفاظت کے لیے خواجہ سرا مقرر کیے جاتے، جنھیں 'آغا' کا ٹائٹل دیا جاتا تھا۔

اُدھر ہندوستان میں مغل بادشاہوں اور سلاطین دہلی نے حرم قائم کرنے کی قبیح روایت جاری رکھی۔ بادشاہ کے علاوہ امرا و عمال سلطنت بھی اپنا حرم اور زنان خانے رکھتے تھے۔حرم کا اعلیٰ معیار اور وسعت اُن کے ''سٹیٹس'' کی نشان دہی کرتے تھے۔

دورِ جاگیرداری کا ایک اور تحفہ عصمت فروشی کی ابتدا تھا۔ جاگیرداری نظام کی مضبوطی کے ساتھ ہی عصمت فروشی اور عورتوں کی خرید و فروخت نے باقاعدہ ''انسٹی ٹیوشن'' کی شکل اختیار کر لی۔ اس ادارے کو پروموٹ کرنے والے وہ مرد تھے جن کے پاس دولت و طاقت کی بہتات تھی جو یک زوجگی کے بعد کثیر زوجگی کو فروغ دینے کے باوجود لونڈیوں باندیوں کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ یہ سماج عورتوں کے ایک مرد سے تعلقات کو مستحسن خیال کرتے تھے۔تاہم ایک عورت کے ایک سے زائد مردوں کے ساتھ تعلقات کو روکنے کے لیے عقیدہ، قانون اور غیرت کا سہارا لیتا۔

چین، جاپان، برصغیر پاک و ہند، سنٹرل ایشیا اور خطہ عرب میں بادشاہوں، امرا اور اشرافیہ نے طوائفیت کو بام عروج پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔مغل بادشاہوں اور سلاطینِ دہلی کے دور میں شاہی محلوں اور قلعوں کے ساتھ ''بازارِ حسن'' قائم ہو گئے۔ ہندوستان میں عصمت فروشی کا پہلا باقاعدہ اڈا محمد تغلق کے عہد میں کھلا۔اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس بطور خاص طوائفوں کے لیے ایک وسیع علاقہ ''شیطان پورہ'' کے نام سے آباد کیا۔اسی طرح دہلی میں چاندنی چوک اور قلعہ معلی سے ملحق ''چاوڑی بازار'' تھا، جہاں ساز و آواز اور جسم بکاؤ مال کی طرح بکتے تھے۔

طوائفوں کے عروج پانے کی وجہ محض شہنشاہوں، امرا، اور جاگیرداروں کی سرپرستی ہی نہ تھی بلکہ اس کی وجہ اس دَور میں عورت کا گرا ہوا سماجی مقام بھی تھا۔شاہی درباروں سے لے کر عام لوگوں کے گھروں تک بیگمات یا بیوی کو شرم و حیا کے نام پر گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا جاتا۔ان کے لکھنے پڑھنے اور فنون لطیفہ کے سیکھنے کی خواہش کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ اس سے عورت کی نہ صرف ذہنی و جسمانی نشوونما متاثر ہوتی تھی بلکہ اس کی تخلیقی صلاحیتیں بھی ختم ہو جاتیں۔مردوں کے لیے اپنی بیوی یا بیویوں میں دلچسپی جلدی ختم ہو جاتی۔ وہ تعلیم یافتہ اور فنونِ لطیفہ میں طاق طوائف کے پاس سکون حاصل کرنے اور تسکینِ ذوق کے لیے جاتے تھے۔طوائف نے معاشرے کے مردوں کی ''ضروریات'' کو پورا کرنے کے لیے ادب، شاعری، مصوری اور موسیقی میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ معاشرہ کی مقید عورت کی نسبت طوائف، سماجی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کرتی تھی اور اس عمل سے اس کی ذہنی سطح بلند ہو گئی۔وہ مردوں کے مباحثوں، ادبی حتیٰ کہ سیاسی گفتگو میں بھی شریک ہوتی تھی۔

جاگیرداری دَور میں یہ عجیب تماشا تھا کہ گھریلو عورت کو عزت و غیرت کے نام پر گھر تک محدود کر لیا جائے اور طوائف کو معاشرہ میں ''کھلی چھوٹ'' دے کر اعلیٰ وارفع مقام پر فائز کر دیا جائے۔ آج بھی دنیا کے جن خطوں میں جاگیرداری نظام موجود ہے، وہاں ملاؤں کی جہادی سرگرمیوں کے باوجود ''بازارِ حسن'' قدیم اور جدید شکلوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

فیوڈل ازم میں عورتوں کی حالت سخت خراب تھی۔ وہ اپنے آقاؤں کی جنسی جائیداد

تھیں۔ارسٹوکریسی کے اندر پیدا ہونے والی عورتیں چھوٹی عمر میں بادشاہوں کے اتحاد کو فروغ دینے کے لیے بیاہ دی جاتی تھیں۔ مادرِ کائنات کے خلاف آسمانی احکامات بھی آنے شروع ہوگئے۔...........اب وہ شیطان کا دروازہ، گناہوں کا گھر اور آفتوں کا مجموعہ بھی بن گئی۔

بلوچوں میں فیوڈل ازم کی مکمل بلوغت سے ذرا قبل جائیں تو معلوم ہوگا کہ بلوچ عورت کی حالت اچھی خاصی بہتر تھی۔ پندرھویں اور سولہویں صدی میں عورت، بلوچ سیاست میں اچھا خاصا حصہ لیتی تھی۔ رندی عہد میں ہمیں حانی کی شخصیت ایک مدبر، دانش ور، حکمتِ عملی کی ماہر اور ایک زبردست ڈپلومیٹ کی حیثیت سے نظر آتی ہے۔اس خاتون کا نام سب سے پہلے اُس وقت ابھر کر سامنے آیا جب وہ شہ مرید کی منگیتر تھی۔اور چاکر و شہ مرید گہرے دوست تھے۔ چاکر کو حانی پسند آئی تو اس نے ''سرداری'' طریقوں سے حانی کو ہتھیا لیا۔ظاہر ہے اُس نے اسے اپنی بیوی بنا کر محل میں ڈال دیا۔اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ رعیت میں سے کوئی شہ مرید اپنی منگیتر کا دیوانہ ہے یا نہ رہے۔

قبیلے کے پیر گھرانے کا فرد ہو، آپ کا جگری دوست ہو، آپ خود قوی سردار ہوں اور پیر گھرانے کے اپنے اُس دوست کی محبوبہ اور منگیتر آپ کو پسند آئے اور آپ سارا رواج رسم اور اخلاقیات روندتے ہوئے اس کی منگیتر ہتھیا لیں تو کیا یہ سیاست ہے کہ نہیں؟ اور پھر آپ کا دوست توہین یافتگی کی انتہا میں نیم زندہ، اپنی سابقہ منگیتر سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کرے تو کیا یہ سیاست ہے؟۔ وہ خاتون جو کل ایک کی اصلی منگیتر تھی، آج دھونس و دھوکے میں دوسرے کی بیوی بن چکی ہے......اب کس کی ننگ ہے، کس کی غیرت ہے۔ کیا اُسے سابقہ منگیتر سے تعلقات قائم کرنے چاہئیں؟ زیرِ مطالعہ داستان میں وہ اس تعلق کو بہت سختی سے ٹھکرا دیتی ہے اور محبوب........... مسترد شدہ محبوب، سماجی مقام سے گرا ہوا محبوب..........جلاوطنی اختیار کرتا ہے۔گو کہ بے ضابطہ اور بے رواج سردار گناہ کی خلش کو حیرت انگیز قابلیت سے دبائے رکھنے کا پی ایچ ڈی ہوتا ہے۔مگر وہ ایک بہترین دوست، ماہر ترین نشانہ باز اور صف شکن بہادر سے بہرحال محروم رہتا ہے۔ بدترین قبائلی جنگوں میں گھرا سردار اپنا یہ مضبوط بازو کھو دیتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم رند و لاشار کی تیس سالہ

جنگ کو سیاسی کہا جائے یا نہیں، قندھار کے ذوالنوں بیگ کے بلوچستان پر قبضہ کی کوشش اور مزاحمت کو سیاسی کہا جائے یا نہیں، رندوں کی ملتان تک پسپائی سیاسی ہے کہ نہیں۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان سب مراحل کی حکمتِ عملی ایک عورت نے بنائی تھی۔اسی عورت نے جسے اپنے محبوب اور منگیتر سے دھوکہ دے کر چھینا گیا تھا۔

حانی کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی ہے؛ وہ قبائلی جنگوں میں اپنے بہادروں کو جنگ پر اکساتی ہے۔اُن کی ہمت بندھاتی ہے۔اپنے طعنوں اور طنز سے انھیں بھاگ جانے یا پسپا ہونے سے روکتی ہے۔وہ چاکر کی جنگی مشیر بن جاتی ہے۔محاذِ جنگ سے متعلق ہر بات کا باریکی سے مشاہدہ کرتی ہے اور اپنے زیرک فیصلوں سے شکست کو فتح بناتی ہے۔ایک بار جب ترک دشمن، بلوچوں پر ہاتھیوں سے حملہ کرتا ہے تو حانی اونٹوں پر لکڑی لاد کر اُن ہاتھیوں کے مقابلے کے لیے اس طرح بھیجتی ہے کہ دشمن کے ہاتھیوں کے قریب پہنچ کر اونٹنیوں پہ لدی ہوئی اس لکڑی اور پیش کو آگ لگوا دیتی ہے۔بے شمار آگ کے شعلوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر خوف زدہ ہاتھی واپس مڑتے ہیں اور اپنے ہی لشکر کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔

چاکری عہد میں ایک اور بڑی عورت گوہر جتنڑ یں کے نام سے ہو گزری ہے۔یہ عورت دو طریقے سے استحصال کا شکار تھی؛ ایک تو بحیثیت عورت اور دوسرا ذات پات کی موجودگی میں کم ذات یعنی جتنڑ یں (جت قوم سے متعلق) ہونے کی وجہ سے۔ یہ بہت مال دار عورت تھی۔اور مہیر کے علاقے سے اپنے اونٹ اور دیگر مویشی لے کر گوہرام سردار کی پناہ میں وہاں کی چراگاہوں میں لائی۔اس خوب صورت عورت سے جنسی تعلق رکھنے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر گوہرام نے بہت کوششیں کیں مگر اُس نے سردار کو انکار کر دیا۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں گوہر وہاں یعنی گوہرام سردار کے علاقے میں نہیں رہ سکتی تھی۔سرداری غیض و غضب سہنے کے لیے تو کوہِ طور اور چلتن جیسے پہاڑ چاہئیں۔چنانچہ وہ وہاں سے نکل پڑی اور چاکر سردار کے دربار میں پہنچ گئی۔اُس سے اُس کے علاقے میں اپنے اونٹوں کے گلے کے چرانے کی اجازت مانگی۔ظاہر ہے چاکر نے اُسے یہ اجازت دے دی۔

ہمیں اندازہ ہوسکتا ہے کہ گوئہرام غصہ سے کس قدر بپھرا ہوگا۔ دوسرے درجے کی شہری خاتون اس کی ملکیت سے دوسرے سردار کی ملکیت میں جو چلی گئی۔ چنانچہ سردار کا بیٹا رامین لاشاری اپنے دوستوں، طبعی اور فکری باڈی گارڈوں سمیت گھڑ دوڑ کے مقابلے میں حصہ لینے جب رند کے جشن میں سے ریحان رند کی گھوڑی سے شکست کھا کر آ رہا تھا تو اس نے اپنا کئی گنا بڑھا ہوا غصہ گوہر پر نکالا۔ اس نے اُس کے سارے شتر بچوں کو تلواروں سے قتل کر ڈالا۔

کچھ ہی دنوں بعد اتفاق سے چاکر آیا۔ کچڑوخ کے نہری علاقہ میں۔ (گوہر کی) ڈاچیاں میلی کچیلی ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں۔ تھنوں سے دودھ بہاتی ہوئی۔

میر چاکر نے خوب صورت گوہر سے پوچھا، تمہاری اونٹنیاں طوفان کیوں مچا رہی ہیں، ان کے تھنوں سے دودھ کیوں بہہ رہا ہے۔

اب یہاں گوہر نہ اپنی وہ تذلیل یاد کرتی ہے جو اسے گوئہرام کے ہاتھوں اٹھانی پڑی۔ نہ وہ مالی و معاشی نقصان خاطر میں لاتی ہے جو اس کے شتر بچوں کے قتل عام سے ہوا۔ وہ نہ ہی اپنی ڈاچیوں کی ممتا بھری فریادوں پر کان دھرتی ہے جو اپنے بچوں کی یاد میں ڈکراتی اور سر مارتی پھرتی ہیں۔ اسے اندازہ ہے کہ اگر اس نے لاشاریوں کے امیرزادے کی حرکت کے بارے میں چاکر کو بتایا تو پہلے سے موجود قبائلی کشیدگی اندوہناک جنگ کی صورت اختیار کرے گی اور ابنِ انسان کا خوں بے پیاں بہے گا۔ امن کی اس دیوی نے اپنے موضوعی مسائل کو پس پشت ڈال کر جنگ و موت کے فرشتے کو یوں بھگانا چاہا؛

''لعل جیسی خوب صورت گوہر نے کہا میر چاکر سردار کو۔ میرے شتر بچوں نے زہریلی بوٹیاں کھالی ہیں۔ مویشیوں میں وبا پھیل گئی ہے۔ شتر بچوں میں جغیں کی بیماری پھیل گئی''۔

بلوچستان کیا، پوری انسانی تاریخ میں عمومی رجحان رہا ہے کہ عورتوں نے ہر وقت برادرکشی کی قبائلی جنگ کو دور رکھا ہے، جنگ کو ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ پوری تاریخ کے اندر آپ کو کوئی بہت بڑا قصہ نہیں ملے گا، جہاں عورتوں کے لشکر نے انسانی کھوپڑیوں سے مینار و چیذغ بنا کر فتح کے جشن کی صورت میں انسانی حجاب و عصمت کو برباد کیا ہو۔ عورت نے کبھی غنیمت کا سامان

سمرقند کے بازاروں میں نہیں بیچا۔ آج بھی ایٹم بم چلانے اور گل زمین پر کروز میزائل جیسے تباہ کن ہتھیار فٹ کرنے کی طاقت مرد ہی نے اپنی پاس رکھی۔ عورت نے ضرورت کے وقت جنگ سے بچاؤ کی مورچہ بندی البتہ ضرور کی۔

مگر گوہر کے ایک بہرے اور بے وقوف گلہ بان نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ وہ درمیان میں بے وقت اچک کر بولا؛

''پرسوں آ گئے لاشاری۔ سیر اور چکر اور گھڑ دوڑ پر۔ یہاں سے وہ گئے مستی میں۔ واپس ہو گئے پستی میں۔ ہمارے شتر بچے کاٹ ڈالے جتی ہوئی حالت میں۔ اپنے بچوں کے فراق میں ڈاچیاں چیختی مٹی اچھالتی ہیں۔ اور ان کا دودھ رانوں پر بہہ رہا ہے''۔

پھر ظاہر ہے اپنی تذلیل کے مداوا میں چاکر سردار نے کیا کیا ہوگا۔ مگر بلند مرتبت گوہر نے اس جنگ کو روکنے کی کیا خوب صورت اور مدلل تدبیریں کی تھیں۔ ناشکرے، کوتاہ بیں اور خان پرست درباری و سرکاری دانش وروں نے کبھی بھی اس خاتون کو اس کا ارفع مقام نہیں دیا۔ محض اس لیے کہ وہ ایک جنتڑیں تھی۔

حیرت ہے دنیا کی اکثر زبانوں میں شعرا نے ایسے قصے بیان کیے ہیں جن میں ایک عورت کی ذات پر تنازعہ کھڑا ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی چاکر و گوئہرام کی پوری لڑائی کا سبب گوہر جنتڑیں کو بنا کر پیش کیا گیا۔ اسی طرح رامائن میں سیتا کے اوپر رام راونڑ کی لڑائی ہوتی ہے۔ اور ہیلن پر ٹرائے اور ایتھنز کی جنگ۔ اور شاہ لطیف کے سُر سورٹھ میں سورٹھ کی ذات تنازعہ کا باعث بنتی ہے۔ عورت ذات کی بدنصیبی ہے کہ اسے استعمال کی کوئی چیز سمجھ کر فریقین اس پر لڑتے رہتے ہیں۔

محترمہ ماہناز، بلوچ تاریخ میں ایک اور ممتاز عورت ہو گزری ہے۔ وہ عورت کی طرف سے ایک بے انصاف سماج سے ٹکر لینے اور قبائلی نظام کی ناروائیوں سے مزاحمت کرنے کی علامت اور سمبل کی حیثیت کی حامل ہے۔ وہ صحیح معنوں میں، سولھویں صدی میں بلوچوں کی قراۃ العین طاہرہ تھی۔ اور اس نے اپنی لازوال جدوجہد کو خوب صورت شاعری کے ذریعے امر کر دیا۔ بلاشبہ قدامت

پرست قبائلی نظام کے رسوم و رواج کی اندھیری کھائیوں میں روشنی کا اتنا بڑا مینار، اور اتنی بڑی شاعرہ وہی مہناز ہی ہوسکتی ہے جس نے عظیم جدوجہد کے تلخ گھونٹ پیے ہوں، جس نے ایک خاموش، مفعول اور خفتہ انسان بن کر خود کو ظلم کی چکی کے حوالے نہ کیا بلکہ بلند آواز سے، برملا اور بلاواسطہ اپنا دفاع کیا۔ بلوچی زبان کے ماتھے پر مہناز کی شاعری ایک انمول، قیمتی اور نایاب جھلملاتا ہوا جھومر ہے۔ اس کی شاعری نہ صرف بلوچوں کے اس زمانے کی تاریخی، ثقافتی اور سماجی حالتوں کی شاہکار ترجمان ہے بلکہ یہ عورت ذات کی بڑائی، ہمت اور بہادری کا نمونہ بھی ہے۔

مہناز، شہداد میاں بیوی کی آپس میں بہت محبت تھی اور زندگی بہت حسین اور خوش گوار گزر رہی تھی۔ اچانک غلط فہمی کا قہر بھرا بچھو شہداد کی آنکھوں کو ڈس لیتا ہے۔ اُسے اپنی بیگم محترمہ مہناز کی پاک دامنی پر شک ہوجاتا ہے۔ یہ جلد باز خاوند اپنی بیوی پر شبہ کر بیٹھتا ہے کہ خدانخواستہ اس کے ناجائز تعلقات اس کے اپنے جگری یار اومر کے ساتھ ہیں۔ وہ بغیر وجہ بتائے محترمہ مہناز کو ڈانٹتا ہے، غصہ ہوتا ہے اور اسے بری طرح پیٹتا ہے۔

اس ڈنڈے ماری کا مہناز نے بہت برا منایا۔ اس زمانے میں شاید عورتوں کو مارنا پیٹنا بلوچوں میں اس قدر مستحسن عمل نہ ہوتا ہوگا۔ اس لیے وہ احتجاج میں کہتی ہے:

''چابک ہوتے ہیں کم ذات لوگوں کے لیے جو گناہ کرتے ہیں۔ چابک تو غلام اور لونڈیوں کی اولاد کے لیے ہوتے ہیں، نہ کہ مہناز کی پھول جیسی پیٹھ پر برسانے کے لیے''۔

حتمی بے گناہی کے باوجود وہ اپنے محبوب خاوند کی بھسم کردینے والی بے رخی کا شکار تھی۔ شہداد کی نفرت بھری آنکھیں، اس کا روکھا رویہ، اور اپنی شریکِ حیات پر بے اعتباری کا اظہار محترمہ کے لی جیتے جی جہنم کے عمیق ترین گڑھے کا عذاب بن گئے تھے۔ جہاں کل تک محبت ہی ساری کتاب، سارا اظہار اور ساری خدائی تھی، وہاں اب نفرت کے سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک طرز کے رویوں نے دوسری طرز کے رویوں کی جگہ لے لی تھی۔ زبانی اظہار کا نہ محبت کی سلطنت میں گزر ہوسکتا ہے اور نہ ہی نفرت کے بے آب و گیاہ دشت میں۔ سلگتی تڑپتی مہناز بالآخر بات کرنے، بات سننے اور بات کی حکمرانی کے قیام کا فیصلہ کرلیتی ہے۔ گفت وشنید اور دلیل بازی ہی شاید ابلیسی منحوس

خصوصیت یعنی نفرت کو سات سمندر پار جلاوطن کرسکے اور محبت کی دیوی اُسے واپس کرسکے۔

یہ تھا حتمی، منطقی اور دل خراش نتیجہ۔ مذاکرات مساوی لوگوں کے درمیان ہی منصفانہ ہوسکتے ہیں۔ مقتدر شخص کے ساتھ مذاکرات کا نتیجہ اُسی کے یک طرفہ فیصلے پر عمل کرنے کی واحد شرط کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ زورآور نے اپنا فیصلہ سنادیا، بہت ہی کھردرے اور بہت ہی نازیبا انداز میں۔ مہناز اپنی یہ تذلیل واقعی زندگی بھر بھول نہ پائی۔ ایک معزز، محبوب اور باوقار بلوچ بیوی، وفا، جس کے کبھی مول نہیں لگ سکتے اور وفا جسے کبھی ناپا تولا اور گنا نہیں جاسکتا۔ اور پھر بلوچ کی وفا؟ اس کا تو کوئی انت، کوئی حد، سرحد اور کوئی افق نہیں ہوتا۔ اور اس اشرف المخلوقاتی لطیف، واحد جائیداد کی رکھوالی کو بلوچ عورت جس طرح لمحہ بہ لمحہ پالتی رہتی ہے، یہ اُسی کا حصہ ہے۔ ماہناز تمام دنیاوی روایتوں اور پابندیوں کو توڑ کر اپنی سنگی سہیلیوں کے ساتھ اپنے ناراض محبوب شوہر کا راستہ روک کر اس کے دوستوں ساتھیوں کے سامنے پاؤں پڑ کر، گڑگڑا کر، رب کا واسطہ دے کر ناکردہ گناہ کی معافی مانگتی ہے۔ مگر گھمنڈ اور تکبر سے لبریز اس کا فیوڈل شوہر، بغیر تحقیق و تصدیق کیے اس پر اتنا بڑا الزام لگانے کے بعد، وہیں، اس مجمع میں سرِ عام اس کو دھکے دے کر گرادیتا ہے اور مستی کے ہوش اڑادینے والے نشے میں بدمست، اُسے طلاق دے دیتا ہے۔ ایسے انسان کو بھول جانا یا اس کو اس کے کیے کی سزا نہ دینا یقیناً بڑی بزدلی ہوتی اور مہناز بزدل خاتون ہرگز نہ تھی۔ اس نے مڑ کر لڑنے کا اٹل فیصلہ اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد جلد باز شہداد پر سے جب، نام نہاد غیرت کے بچگانہ فیوڈل جذبات کی دھند چھٹی اور مہترمہ مہناز کے اوپر لگائے جانے والے الزامات جھوٹے لگے تو محبت کا استحقاق مجروح کرنے والا شہداد بہت پشیمان ہوا۔ اس نے اپنی محبوبہ کو خود اپنے ہاتھوں سے دھتکارا تھا۔ اس نے خود ہی اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک، پرکشش مہناز کو دھکیل کر خود سے علیحدہ کردیا تھا۔ مہناز کی روح کی جڑیں تک خاکستر کردی تھیں۔ اب مہناز کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ چنانچہ اس نے اسی اومر سے شادی کرلی جس کے ساتھ اسے بدنام کیا گیا تھا۔ اس قدم سے مہناز نے شہداد کی فرعونیت اور غرور کو مٹی میں ملادیا۔ اور یہ عمل اس وقت کے بلوچ سماج کی مروج منفی قدروں اور مرد کی بالادستی کے

خلاف جوابی جنگ میں چلایا جانے والا عورت کا پہلا کارتوس تھا۔جس کے جواب میں لامحالہ سابقہ شوہر نے کھوکھلے سماجی متبرکات کو حرکت میں لانا تھا۔ چنانچہ بپھری ہوئی انا کے مالک، شھداد نے مہناز اور اومر کی شادی کو اپنے سابقہ الزام کے جائز ہونے کا ثبوت بنا ڈالا۔اس نے کہنا شروع کر دیا کہ اومر سے شادی کر کے گویا مہناز نے خود ہی ثابت کر دیا کہ اومر کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات تھے۔ غصے، پشیمانی اور فیوڈل انا میں لپٹا ہوا شھداد مہناز کے خلاف شاعری کرتا ہے۔

مہذب ترین بلوچ خاتون نے نام نہاد دانش وری کا جواب دانش سے دینے کا فیصلہ کیا۔شاعری کی۔شاعری بھی ایسی جو دل کی گہرائیوں سے، پکے اور صاف جذبات میں لپٹی ہوئی، بپھرتی ہوئی شیرنی کی گرج اور زخمی بھیڑیے کے غصے سے بھری اور کھری شاعری۔اس نے اُس کے الزامات کا بہت خوب صورتی سے جواب دیا۔خود شہذاذ کی عقل، تدبر اور فراست پہ طنز کے تیر برسائے۔ یہ موخر الذکر انداز بلوچی شاعری میں باقاعدہ ایک صنف ہے جسے ''سٹغ'' کہتے ہیں اور اس صنف میں محترمہ ماہناز شاید بلوچی کی سب سے ممتاز، مہذب اور مدلل شاعرہ اور استاد ہے۔

سولہویں صدی کی اس بلوچ شاعرہ نے اپنی عصمت اور عزت و وقار کی باتیں کیں خوب صورت شاعری میں۔مردانہ سماج کو للکارا اور عورت کے احترام اور آزادی کی خواہش کی۔اس سے الزامات اور رسوائی کا سامنا کیا، جو مخالفتوں اور سماجی بندشوں سے نمٹی اور جس کے قدم فیوڈل بنیاد پرست زندگانی اور رسم و رواج کے خوف ناک سماج سے نہ ڈگمگائے۔مہناز عورتوں کی جدوجہد کا روشن ستارہ ہے۔ وہ تنِ تنہا پورے سماج سے لڑی اور محبت کی قوت سے فتح پائی۔کہیں مصلحت، مصالحت اور موقع پرستی نہ دکھائی اور مستقبل کی لڑنے والیوں کو جدوجہد کا راستہ دکھایا......ایک نیک دل اور مکمل بلوچ حکومت میں تاریخ دیکھے گی کہ بلوچی غیرت پہ ڈٹی ہوئی مہناز کے مجسمے چوکوں پہ نصب ہوں گے اور بلوچ ہونہار بچے اُس کی مزاحمتی شاعری کو ترنم سے کورس میں گائیں گے اور بلوچ والدین ماضی کے اپنے شان دار پس منظر میں اپنے درخشاں مستقبل کے ان ننھے سفیروں کو پیار بھری نظروں سے دیکھیں گے۔

اس مذکورہ واقعے میں دو اور باتیں بھی ظاہر ہیں؛ ایک تو اس وقت کے بلوچ سماج میں

سیاہ کاری کا رواج موجود نہ تھا۔اگر ہوتی تو شہذاذ نے مہناز کو طلاق نہ دی ہوتی بلکہ قتل کیا ہوتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورت کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کا حق حاصل تھا۔اس لیے مہناز نے اومر سے شادی کر لی۔

بلوچ سماج سولہویں صدی سے لے کر آج تک بہت ہی متنوع انداز میں قائم ہے۔ مجموعی طور پر ماقبل فیوڈل سماج کا زور ہے مگر فیوڈل ازم اور کیپٹلزم بھی بڑے پیمانے پر اپنی جڑیں مضبوط کر چکے ہیں۔درمیان میں بلوچوں کے ایک بڑے حصے (سوویت یونین اور افغانستان کے بلوچوں) نے سوشلزم کا شیریں میوہ بھی چکھ لیا۔جس پر الگ سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

جب ہم سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل کے بلوچستان (مغربی، مشرقی اور شمال مغربی) کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ نصیر خان نوری نے سرقبیلوی معاشرے کے اُس حصے میں ایک مضبوط فیوڈل ریاست عروج تک پہنچائی جو دارالحکومت قلات کے زیادہ کنٹرول میں تھا۔نوری نصیر خان کو بلوچوں میں بڑی عزت و توقیر سے دیکھا جاتا ہے۔اس اصلاح پسند حکمران نے اپنے پڑوسی فیوڈل حکمرانوں کے ساتھ مل کر نہ صرف اپنی سلطنت کو مستحکم کیا بلکہ اس کی سرحدوں کو بھی کسی حد تک اُس کی قدرتی جغرافیائی و تاریخی منطقوں تک وسیع کر دیا۔مگر ایک تلخ حقیقت دیکھیے کہ اس خان نے ہی ذکری بلوچوں پر مہلک حملے کیے، اور اُسی نے ہی خواتین کا ورثہ دینے کا شرعی حق منسوخ کیا تھا۔(6)

مست توکلی اور سمو، اسی طرح بیبرک اور گراں ناز کے گرامی نام صرف محبت کرنے والے جوڑوں کے نام نہیں ہیں بلکہ انھوں نے عشق کے میدان کو منتخب کر کے عورتوں کی تحریک کے لیے فقیدالمثال روایتیں قائم کیں۔ان کا ذکر ہم ایک الگ کتاب میں کر چکے ہیں جو ''مستیں توکلی'' کے اعلیٰ اور مبارک نام سے چھپ چکی ہے۔ہم اِن بڑے انسانوں کا ذکر بار بار کرتے رہیں گے۔ یہاں ہم دو تین اور خواتین کا ذکر صرف یہ جھٹلانے کے لیے کرنا چاہتے ہیں کہ ''عورتیں گویا بہادر، کمانڈر اور مجاہد نہیں ہوسکتیں، یا عورت صرف سالن چولہا کے لیے بنائی گئی ہیں''۔

مائی بیبو خان قلات احمد خان اول (1666 تا1696) کی بہن تھی۔جب میر احمد خان

سیوی کے باروزئیوں سے جنگ کر رہا تھا اور پانچ جنگوں کے بعد شکست کھائی تو بیبو، احمد خان کا لشکر تیار کر کے اپنی سربراہی میں جنگ کے میدان میں لے آئی۔ وہ فوج کو لے کر قلات سے سیوی کی طرف روانہ ہوئی۔ اس خاتون کے لیے باروزئیوں کے ملاّ شیخ فاضل نامی شخص نے اپنے منظوم ''گنج نامہ'' میں یوں کہا:

یکے خواھرش بود بیبو بہ نام
چو مردان بہ دیوان نشستی مدام
ہماں مرداں کردہ اُو را سلام
بہ گردش ہمہ مرداں خاص و عام
زنے بود دانا بسی ہوشیار
بہ مردانگی درجہان اشتہار

(معلوم نہیں میدانی علاقوں کے غیر بلوچ ثقافتوں میں بہادری کیوں صرف مردانہ ہوتی ہے، زنانہ نہیں ہوتی۔ بلوچ سماج میں بہادری بلوچ کی صفت ہے، خواہ وہ عورت ہے یا مرد، بچہ ہے یا جوان۔

بی بی زینب خان قلات، میر محمود خان کے زمانے کی ایک ہیرو تھی۔ وہ اپنے منجھلے بھائی میر مصطفیٰ خان کے قلعے میں رہتی تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی میر محمد رحیم نے مصطفی خان کو قتل کر دیا۔ بی بی زینب نے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور گنداواہ میں محمد رحیم پہ ٹوٹ پڑی۔ محمد رحیم اپنے 30 ساتھیوں سمیت اس جنگ میں مارا گیا۔

حوالہ جات

1۔ براؤں، بی۔ دی باڈی اینڈ سوسائٹی، 1988، کولمبیا یونیورسٹی پریس، صفحہ 14

2۔ ساگان، کارل۔ دی ڈیمن ہانٹڈ ورلڈ، مارچ 1997، بیلنٹائن بکس نیو یارک، صفحہ 123

3۔ ساگان، کارل۔ دی ڈیمن ہانٹڈ ورلڈ، مارچ 1997، بیلنٹائن بکس نیو یارک، صفحہ 127

4- کارل ساگاں/ عامر بٹ'' توہمات کی دنیا''، 2001 ، مشعل نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور، صفحہ 265

5۔ کماری، جے وردنے ''فیمنزم اینڈ نیشنل ازم اِن دی تھرڈ ورلڈ''، 1994، اثر پبلی کیشن، لاہور، صفحہ 32

6۔ ہیتو رام، تاریخ بلوچستان، صفحہ 110

عورت، کیپٹلسٹ عہد میں

1660 سے لے کر 1666 تک کے برطانوی انقلاب میں عورتوں نے زبردست حصہ لیا۔اسی انقلاب کے نتیجے میں انگلینڈ سے فیوڈل ازم کا خاتمہ ہوگیا اوراس کی جگہ کیپٹل ازم نے لے لی۔اس انقلاب نے فیوڈل نظام کے مقابلے میں تو عورتوں کی حالت بہت بہتر کردی،مگر ان کی حیثیت کے اندر کوئی صفتی تبدیلی برپا نہ ہوئی۔جب وہاں مشہورِ زمانہ چارٹسٹ مومنٹ شروع ہوئی تو عورتوں نے اس میں زور شور سے حصہ لیا،حالاں کہ اس تحریک نے مطالبات کی اپنی لسٹ میں صرف ووٹ کا مطالبہ شامل کیا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد برطانوی سرمایہ دار کو محنت مزدوری کے لیے عورتوں اور بچوں کی سخت ضروری پڑی،اس لیے بے شمار عورتیں کارخانوں اور معدنی کانوں میں کام کرنے لگیں۔مگر ان جگہوں پر حالات کار بہت خراب تھے،اوقاتِ کار بہت طویل تھے اور معاوضہ بہت قلیل تھا۔

1824 میں ''روڈ آئرلینڈ'' میں عورتوں نے پہلی بار ہڑتال کی۔102 مزدور عورتوں نے جولاہے بھائیوں کی حمایت میں ہڑتال کی جو کہ معاوضوں میں کمی اور کام کے دن کی طوالت کے خلاف احتجاج کررہے تھے۔

1825 میں عورتوں کی پہلی یونین قائم ہوئی: متحدہ درزی عورتوں کی یونین نیویارک۔اسی

یونین کے زیراہتمام 1831 میں 1600 خواتین نے''ہماری محنت کا منصفانہ معاوضہ'' کے لیے ہڑتال کی۔

1872 میں امریکی کانگریس نے ایک قانون منظور کر کے عورتوں کو مساوی کام کا مساوی معاوضہ دیا۔

اُدھر 1857 سے لے کر 1893 تک عورتوں کے بہت بڑے جلسوں اور جلوسوں کے بعد انگریز عورت کو جائیداد رکھنے کا حق ملا۔ووٹ کا حق اُسے جا کر 1888 میں ملا،وہ بھی اس شرط پر کہ اس کی عمر 30 برس تک پہنچ چکی ہو جب کہ مرد کے لیے یہ عمر محض 21 برس تھی۔یہ امتیاز طویل جھگڑے اور جدوجہد کے بعد کہیں جا کر 1928 میں ختم کیا گیا۔

بوثائینہ نے لکھا کہ،''ہیرو عورتیں سماج میں عورت کی روایتی حیثیت کی بلند دیوار میں دراڑیں پیدا کرتی ہیں''۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فلورنس نائٹ انگیل نے نرسنگ کے بے ہنر پیشہ کو استادی اور کمٹ منٹ سے ناموس والا پیشہ بنا ڈالا۔اور برطانوی عورتوں نے اُس کے نقشِ قدم پر چل کر اپنی روایتی حیثیت سے باہر جھانکنا شروع کیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ 1895 میں انگلینڈ میں ڈھائی ہزار عورتیں رجسٹرڈ ڈاکٹر بنیں۔مگر برابری والی بات آج بھی دور ہے۔اس حقیقت کے باوجود کہ برطانوی عورتوں کی تحریک عالمی جمہوری تحریک کی ایک فعال شاخ ہے مگر 1975 کے اعداد وشمار کے مطابق بھی انگلینڈ میں زنانہ وکیل صرف 4 فیصد، لیڈی ڈاکٹرز صرف 16 فیصد، لیڈی ڈینٹسٹ 7 فیصد اور سائنس دان صرف چھ فیصد تھیں۔

ذرا پیچھے جا کر انقلاب فرانس میں جھانکیں تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ اس تحریک میں بھی عورتوں نے زبردست طور پر حصہ لیا تھا۔بالخصوص''روٹی کے فسادات'' نامی جدوجہد میں عورتیں پیش پیش تھیں۔مگر مذاق دیکھیے کہ جب یہ انقلاب کامیاب ہوا تو اس کی نعمتوں کی تقسیم کے وقت عورتیں مکمل طور پر محروم کردی گئیں۔1789 میں فرانس کی اسمبلی نے عورتوں اور مردوں کے مشترکہ حقوق کی بحالی کے بجائے''مرد کے حقوق'' کا مسودہ پیش کیا۔اس لیے 1791 میں اس کے جواب میں Olympediques نے''عورت کے حقوق کا ڈیکلریشن'' جاری کیا جس کے اندر عورت کو

مرد کے برابر کے سارے حقوق دینے کے مطالبات کیے گئے۔اس ڈیکلریشن میں یہ مشہور فقرہ بھی لکھا ہوا تھا: ''اگر عورت کو پھانسی کے پھندے تک رسائی کا حق حاصل ہے تو پھر اُسے پارلیمنٹ تک رسائی کا حق بھی ملنا چاہیے''۔

انقلابِ فرانس سے لے کر آج تک فرانسیسی عورت وہاں کے مرد کی بہ نسبت کم تنخواہ اور کم سہولتوں کے ساتھ کام کر رہی ہے۔1840 میں فیکٹری کی ''عورت مزدور'' کا معاوضہ مرد کے معاوضے سے محض کم ہی نہ تھا بلکہ اس کا نصف تھا۔یہ بھی انقلاب کا عجیب پہلو ہے کہ وہ سیاسی کلب کہ جنھیں چلانے والیاں عورتیں تھیں، اور جنھوں نے انقلاب کی خاطر اپنے سروں تک کی پرواہ نہ کی، وہی سیاسی کلب 1793 میں بند کر دیے گئے نہ صرف یہ بلکہ وہاں تو عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے پہ تنقید شروع ہو گئی۔مختصر یہ کہ انیسویں صدی تک فرانس کی عورت اپنے چھوٹے چھوٹے حقوق کے لیے بھی ترس رہی تھی۔سرکاری نوکریوں میں وہ صرف سکول ماسٹر یا ڈاکیہ ہی بن سکتی تھی۔قانونی طور پر خاندان کا خرچہ مرد کے ہاتھوں میں تھا۔اور غیر رسمی جنسی تعلقات کی سزا مرد کو نہیں، صرف عورت کو دی جاتی تھی۔

انقلابِ فرانس کے بعد فرانس میں عورتوں کی تنظیمیں جس طرح تباہ کی گئیں، اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والی عورتیں جس طرح جلاوطن کی گئیں، وہ سب انسانی تاریخ کے مزاحیہ باب کا حصہ بن گئیں۔

1871 میں فرانس دنیا کا ایک اور بڑا کارنامہ کرتا ہے، یعنی پیرس کمیون۔اس پیرس کمیون میں ایک بار پھر فرانس کی عورت نے مرد کے شانہ بشانہ جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔یہیں جا کر اُسے موقع ملا کہ وہ یونیورسٹیوں میں داخل ہو سکے۔1875 میں اُسے یہ اجازت ملی کہ وہ ڈاکٹر بن سکے ، اور سال 1900 میں اُس پہ وکیل بننے کی اجازت عطا کرنے کا احسان کیا گیا۔ ابھی 1965 تک فرانس کی کسی عورت کو اجازت نہ تھی کہ بینک میں اپنا ذاتی اکاؤنٹ کھولے۔

اب ذرا ہمارے سیٹو سنٹو کے دوست ، ترکی پر نظر دوڑایے؛ ترکی پر 18ویں اور 19ویں صدی میں سب سے بڑے اثرات فرانس کے تھے۔ انقلابِ فرانس کے اثرات

یہاں 1789 کے بعد سے نظر آئے،'' جب کہ خود یہ انقلاب ابھی جاری تھا کہ اس کے نظریات کا ترکی میں پہلا اہم ترین دخول اُس عظیم سیلاب کی راہ ہموار کرتے ہوئے ہوا جس نے ترکی کے نقطہ نظر، فکر اور خودداری کو بدل ڈالا''۔(1)

ذرا دیکھیے تو کہ 1798 میں ترکی کی قدیم عثمانیہ بادشاہت کے چیف سیکرٹری کی طرف سے ریاست کی ہائی کونسل کے لیے لکھے ہوئے میمورنڈم میں کیا لکھا گیا۔ایسا لگتا ہے کہ ضیاالحق کا کوئی سیکرٹری اپنے صدر کو لکھ رہا ہو:

''والٹیئر اور روسو جیسے جانے پہچانے اور مشہور دہریوں اور ان کی طرح کے دیگر مادہ پرستوں نے ایسی کتابیں لکھیں جن میں نعوذ باللہ پاک پیغمبروں اور عظیم بادشاہوں کی بے حرمتی کی گئی۔ان تحریروں میں سارے مذاہب کا خاتمہ اور برطرفی ہے اور مساوات اور ری پبلکن ازم کی مٹھاس کا دھوکہ ہے۔یہ سب باتیں بہ آسانی سمجھ میں آنے والے الفاظ اور فقروں میں عام آدمی کی زبان میں بیان کی گئی ہیں''۔(2)

صرف یہی نہیں بلکہ سلطان کی رعایا کو خبردار کرنے والے ایک اعلامیہ میں ان نظریات کا مزید پیچھا کیا گیا؛''یہ نظریات زور دیتے ہیں کہ سارے انسان برابر ہیں اور انھیں ایک دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے''۔(3)

اگر ایک طرف فرانس کے انھی اثرات کے تحت بہت سی اصلاحات کی گئیں اور ترکی بادشاہت کے زیر اثر علاقوں میں کافی تبدیلیاں ہوئیں تو دوسری طرف رجعت پسندوں اور قدامت پسندوں کی طرف سے فرانسیسی اثرات اور ترکی میں اصلاحات کی مخالفت بھی تیز رفتاری سے بڑھتی رہی۔حتیٰ کہ 1807 میں بغاوت ہوئی اور اس وقت کے سلطان سلیم سوئم کا تختہ الٹا گیا اور خارجی اثرات رکھنے والے لوگوں کا قتل عام کیا گیا۔

مگر بہرحال اصلاحات کی لہریں چلتی رہیں۔سلطان محمود دوئم نے 1828 میں ترک افواج میں لباس اور طرز کی زبردست اصلاحات کیں اور خود بھی خارجی سفیروں کے استقبالیوں کے وقت یورپی پروٹوکول کا طریقہ اپنایا............1839 میں عبدالمجید نے سلطان بن کر ''تنظیمات''

کے نام سے ایسی اصلاحات کیں جن سے ترکی ایک تھیوکریٹک باشاہت سے ایک جدید ریاست کی طرف ڈھلنے لگا۔ قانون کے آگے سارے مذاہب کے افراد کو مساوی درجہ دینے کا اقدام اٹھایا گیا۔............1847 میں وزارت تعلیم قائم کر کے تعلیم کے شعبے میں ملاّؤں کی اتھارٹی ختم کر دی گئی۔1912 میں حکومت قائم کرنے والے سپاہی اور سکالر احمد مختار کا نظریہ تھا کہ ''یا تو ہمیں مغربی طرز اپنانا ہوگا وگرنہ ہم تباہ ہو جائیں گے''۔(4)اسی تحریک کے عبداللہ نے 1912 میں ایک مضمون میں لکھا کہ مستقبل کا مغربی طرز اپنایا ہوا ترکی دیگر باتوں کے علاوہ ایسا ہوگا جہاں سلطان کی صرف ایک بیوی ہوگی، حرم نہیں ہوگا، عورتیں جو لباس چاہیں گی پہن سکیں گی۔ وہ اپنے لیے شوہر خود چنیں گی۔(5)۔ترک شاعر ضیا گوکلپ نے عورت کا مقام یوں بیان کیا؛

سب کچھ کو
برابر ہونا چاہیے
شادی، طلاق، دولت!
کوئی قوم ترقی کر ہی نہیں سکتی
جب تک کہ
اس کی بیٹیاں،
وہ اہمیت نہ پائیں جس کی کہ وہ حق دار ہوں
ہم لڑے اور
ہم نے پائے دیگر سب حقوق،
صرف خاندان رہ گیا
عہد تاریکی میں
کیوں ہم
ابھی تک عورتوں کی طرف پشت کرتے ہیں؟
بتاؤ مجھے

کیا
ہماری جدوجہد میں ان کا کوئی حصہ نہیں؟!! (6)

............اور پھر مصطفیٰ کمال نے 1920 میں انقرہ میں روشن فکر حکومت قائم کی۔اس نے 1923 میں بادشاہت ختم کر کے صدر کا عہدہ سنبھالا اور 1938 میں اپنی موت تک اقتدار میں رہا۔ اُس نے اتاترک (ترکوں کا باپ) کی حیثیت سے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا، مغربی کیلنڈر اپنایا، ترکی زبان کا پرانا رسم الخط ختم کر کے رومن رسم الخط شروع کیا، اور، روایت پر تنقید کی۔اس نے یورپی لباس رائج کیا، سول میرج اور طلاق متعارف کرائے اور ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی لگا دی۔

مصطفیٰ کمال کے اِن اقدامات نے اڑوس پڑوس یعنی ایران، افغانستان اور ہمارے علاقوں کو بہت متاثر کیا۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کوئی کمیونسٹ تھا۔حقیقت میں وہ کٹر کمیونسٹ دشمن تھا۔(واضح رہے کہ ترکی کی کمیونسٹ پارٹی 1920 میں سوویت یونین میں قائم ہوئی، مصطفیٰ صوفی اس کا سربراہ تھا۔جنوری 1921 میں صوفی اور دیگر کمیونسٹ راہنماؤں کو ترکی جانے کے جال میں پھانس دیا گیا۔اور انھیں پانی میں ڈبو کر مار دیا گیا)۔

المختصر، فیوڈلزم میں عورت کو محض جائیداد تصور کیا جاتا تھا (اب بھی یہی تصور جاگیرداری معاشروں کا خاصہ ہے)۔لیکن جب جاگیردار معاشرے میں انڈسٹریلائزیشن کی ابتدا ہوئی تو عورت کے سماجی مقام میں تبدیلی آئی۔اب عورت صنعتی معاشرہ کی ضروریات کے تحت گھر کی چار دیواری سے باہر آ کر پیداواری عمل اور صنعتی ترقی میں حصہ لینے لگی۔لیکن یہاں بھی وہ سرمایہ دار مرد کی استحصالی فطرت کا شکار ہوئی۔اس نے فیکٹریوں میں مردوں سے کم تنخواہ پر کام کیا۔گذشتہ تمام ادوار کی نسبت سرمایہ داری دَور میں اس پر کہیں زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ایک جانب وہ سرمایہ دار کے لیے کم اُجرت پر کام کرتی تو دوسری طرف گھریلو ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے بچوں کی پرورش کرتی اور اپنے ''مجازی یا مزاجی خدا'' کو ہر ممکن طریقوں سے خوش رکھنے کی کوشش کرتی۔

کپٹلزم کا ایک اور ظالم پہلو یہ بھی ہے کہ عورت کے ساتھ رشتوں کا تصور خاصا کمزور ہوگیا۔ اس نظام میں عورت کی حیثیت ''کماڈٹی'' کی سی ہوگئی۔ فیوڈلزم میں ''تسکین پہنچانے والی عورت''، کپٹلزم میں اپنے اسی خاص وصف کے باعث اشیا کی خرید وفروخت میں اضافہ کرنے والی شے بن گئی۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا میں مختلف اشیا کی اشتہار بازی میں عورت کی موجودگی (ایک خاص انداز میں) کپٹلزم کی پیداواری ضرورتوں کے تحت ہوتی ہے۔ لہٰذا کپٹلزم میں عورت کے حسن وخوب صورتی کو مارکیٹ پوائنٹ آف ویو سے کیش کرایا گیا ہے۔

1917 کے انقلاب کے بعد نئی سوویت عوامی حکومت نے عورتوں کو قانون کے تحت مکمل برابری عطا کردی۔ اسقاطِ حمل کو حمل کے کسی بھی مرحلے پر مفت اور قانونی قرار دیا گیا اور ان تمام قوانین کو ختم کیا گیا جو پیٹ کے اندر بچے کو انسانی حقوق دیتے تھے۔ مزدوروں کی بھرتی اور چھانٹی میں صنفی امتیاز پر پابندی لگادی گئی۔............ یہ قانون صرف اور صرف سول میریج کو تسلیم کرتا تھا اور اس میں کسی بھی پارٹنر کی طرف سے سادہ درخواست پر طلاق کی اجازت دیتی تھی۔ 1926 میں de facto تعلقات کو قانونی تعلقات کے برابر کردیا گیا۔ آئین میں سے ناجائز اولاد کی شق ختم کردی گئی۔ شادی کے معاہدے سے آزاد خاندانی تعلقات بنانے کی آزادی دی گئی۔ خاندان کے بجائے ریاست کی طرف سے بچے کی پرورش کرنے کی طرف پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ''لے پالکی'' ختم کردی۔ جائیداد کو شادی سے وراثت میں ملنے سے الگ کردیا گیا۔(7)

18ویں اور انیسویں صدیوں کے جمہوری انقلابات کے نتیجے میں ووٹ کے سابقہ بے حق مرد آبادی کو، ووٹ کا حق ملنے کے بعد ہی عورتوں کو ووٹ کا حق دینے کی منظم جدوجہد تیز ہوئی۔

صنفی عدم برابری اس عقیدے کے بنا پر تاریخ پر چھائی رہی کہ عورتیں دلیل واستدلال کی کم اہلیت رکھتی ہیں مردوں سے۔ دنیا میں پہلے پہل صرف زمین رکھنے والوں (کبھی کبھی والیوں) کو ووٹ کا حق ملتا مگر امریکہ میں 19ویں صدی کے اوائل میں زمین رکھنے والوں تک ووٹ محدود رکھنا ترک کردیا گیا اور صرف بالغ مردوں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ یعنی عورتوں کو مار ہی پڑی۔ اب صنفی بنیاد پر ووٹ کا حق دیا اور چھیننے جانے لگا۔

برطانیہ میں جا کر 1918 میں 30 سال سے اوپر والی عورتوں کو ووٹ کا حق ملا۔ دس برس بعد رائے دہی کی عمر کو 21 برس کردیا گیا۔

انگریز سامراج نے جب اس پورے خطے پر قبضہ کرلیا تو اُس کے خلاف چلنے والی سامراج دشمن تحریک میں عورتوں نے بھی زبردست کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے ایک معتبر لیڈر جواہر لال نہرو کی طرح بلوچ تحریک آزادی کے سربراہ یوسف عزیز مگسی نے بھی نے اپنی کتابوں، مضامین، مراسلوں اور تقاریر میں عورتوں کے حقوق کے بارے میں زبردست موقف اختیار کیا۔ مثلاً اپنی 31 مارچ 1928 کی الہ آباد تقریر میں دوٹوک الفاظ میں نہرو نے کہا تھا: ''انڈیا اُس وقت تک آزاد نہیں ہوسکتا جب تک کہ انڈیا کی عورتیں انڈیا کے مردوں سے اپنی مکمل آزاد حاصل نہیں کرتیں''۔ نہرو ہی نے کہا تھا کہ ''سماجی سخت پابندی اور بچپن کی شادیوں کا لازمی نتیجہ بچپن کی بیوگی نکلتا ہے۔ اگر عورت معاشی طور پر آزاد اور کماؤ نہیں ہے تو اسے اپنے خاوند یا کسی اور پر انحصار کرنا ہوگا اور انحصار کرنے والے کبھی آزاد نہیں ہوا کرتے''۔(8)

1928 والی الہ آباد کی تقریر میں نہرو نے یہ بھی کہا تھا کہ ''میں آپ سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی عورت کی حالت سے سخت غیر مطمئن ہوں۔ ہم سیتا اور ساوتری کے بارے میں بہت کچھ سنتے ہیں۔ یہ انڈیا میں معزز نام ہیں اور ہونے بھی چاہئیں۔ مگر مجھے اندیشہ ہے کہ ماضی کی بازگشت اس لیے اٹھائی جارہی ہے کہ ہماری آج کی کمزوریاں چھپ جائیں اور ہم انڈیا میں آج عورت کی تذلیل کے اصل سبب پہ حملہ نہ کریں''۔

1930-31 میں عورتوں نے پہلی گول میز کانفرنس میں ایک یادداشت پیش کی۔ عورتوں نے اس مطالبہ کے ساتھ کہ انسانوں کو حقوق، بغیر امتیازِ مذہب، ذات اور جنس کے دیے جائیں۔

دور کیوں جایئے، آیئے ہم خود اپنے بلوچ اکابرین کی ان قراردادوں کی طرف توجہ دیں جن کے مرتب کرنے اور منظوری دینے میں نواب میر یوسف علی خان مگسی جیسی جلیل القدر شخصیتیں شامل تھیں۔ کانفرنس کا نام ''آل انڈیا بلوچ اینڈ بلوچستان کانفرنس'' رکھا گیا۔ اس کانفرنس میں

بلوچستان کے علاوہ سارے ہندوستان کے بلوچوں کو بلایا گیا تھا۔ یہ کانفرنس 27 دسمبر سے لے کر 30 دسمبر 1932 کو جیکب آباد میں منعقد ہوئی۔ آیئے اس بڑی قوم کی بڑی کانفرنس کی بڑی قراردادوں کو دیکھتے ہیں اور اپنا سر فخر سے بلند کرتے ہیں:

ایک قرارداد میں کہا گیا:

’’کانفرنس اس نظام کو حقارت اور مذمت کے ساتھ دیکھتی ہے کہ کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اُس شخص کے بچھڑے ہوئے روپے کی سزا بھگت کر مقتول کے فریق میں لازمی شادی کرنی پڑے۔ یہ کانفرنس بلوچستان کی برطانوی حکومت اور ریاستی کنفیڈریشن سے اپیل کرتی ہے کہ انسانیت، برابری اور انصاف کے مقدس اصولوں کے نام پر اس بہیمانہ عمل کو مکمل طور پر روک دیا جائے، انتقام کے شیطانی کارناموں کے لیے معصوم لڑکیوں کو سزا نہ دی جائے‘‘۔

آج جو دانش ور بلوچ معاشرے میں لب اور ولور کی موجودگی سے انکار کرتے ہیں، اُن کی خدمت میں 1932 میں منظور کردہ بلوچ کانفرنس کی یہ قرارداد پیش کرتا ہوں:

’’یہ کانفرنس بلوچستان کی حکومت اور عوام سے مطالبہ کرتی ہے کہ لب اور ولور کے رسوا کن عمل کو ختم کیا جائے‘‘۔

یہ قومی راہنما ہر جگہ اور ہر وقت بلوچستان میں لب جیسی دختر فروشی کو ظلمِ عظیم قرار دیتے رہے، جس سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے، عورت کی توہین ہوتی ہے۔ مولانا محمد عبداللہ نے اس قومی تحریک کے راہنماؤں کی محنت کو یوں بیان کیا ہے؛ ’’بلوچستان میں جب سے قومی تحریک عمل میں آئی ہے اس شرم ناک رسم (ولور، لب) کے خلاف اصلاح پسند نوجوانوں نے تحریری اور تقریری جہاد میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا‘‘۔(9)

’’یہ کانفرنس حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ اس رواج کو ختم کرے جو بیواؤں اور دوسری عورتوں پر مالکانہ حق دیتا ہے جیسے کہ یہ زمینی جائیداد وغیرہ‘‘۔

عورتوں کی تعلیم کے بارے میں 1932 کے ہمارے غیرت مند بلوچوں نے یہ قرارداد منظور کی؛ ’’یہ کانفرنس بلوچستان کی برطانوی حکومت اور ریاستی کنفیڈریشن سے درخواست کرتی ہے

کہ عورتوں کی تعلیم کے کاز کی بڑی گرم جوشی سے مدد کریں۔ اور بلوچستانی عوام سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس طرف خاص توجہ دے‘‘۔(10)

جناب محمد امین کھوسہ کو ایک خط میں جناب یوسف عزیز مگسی یوں کہتا ہے؛

’’ایک دن آئے گا جب بلوچوں کو مظلوم لڑکیوں کے حقوق دینے ہوں گے‘‘۔(11)

ہمارے آباؤ اجداد کی ان دُہائیوں، فریادوں اور اپیلوں پر بلوچوں نے تقریباً ایک سو سال کے عرصے میں کیا رویہ اختیار کیا، یہ ہم سب جانتے ہیں۔!!

بلوچستان کے مندرجہ بالا اکابرین اپنے خیالات میں بہت باتوں پہ سوشلزم سے متاثر تھے۔ بالخصوص عورتوں کے بارے میں سوشلزم کے اندر موجود زبردست پروگرام اور گنجائش کے وہ بہت زیادہ معترف تھے۔ ان کے لیے ماڈل اور محبوب ریاست یعنی سوویت یونین میں عورتوں کی تحریک کا آغاز 19 ویں صدی کے اواخر میں دانش ور طالبات میں ہوا۔ یہ تب جارحانہ اور انقلابی سرگرمی کے ساتھ منسلک تھی۔ روس جاپان جنگ کے دوران عورتوں نے بہت سے کاموں میں مردوں کی جگہ لے لی اور برابری کے منظّم مطالبات کیے۔ 1905 کے بعد انھوں نے سیاسی ہڑتالوں میں حصہ لیا۔ 1917 میں انقلاب سے چند روز قبل انھوں نے سینٹ پیٹرسبرگ میں پرہجوم مظاہرہ کر کے روٹی، امن اور اپنے مردوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

انقلاب نے روسی عورت کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ سوویت آئین میں باقاعدہ لکھا تھا:

’’سوویت روس میں عورت کو بھی تمام معاشی، سرکاری، ثقافتی، عوامی اور سیاسی زندگی کے تمام حوالوں سے مرد جیسے حقوق حاصل ہیں‘‘۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل میں یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی گئی جو مندرجہ ذیل مطالبات کرتا ہے:

’’..........قانون کے سامنے اور عملی زندگی میں عورت اور مرد کی سماجی برابری، ازدواجی حقوق اور خاندانی ضابطے میں انقلابی تبدیلیاں، حمل کو بطور سماجی فریضہ تسلیم کرنا، بچوں اور نوجوانوں کی پرورش اور تعلیم میں معاشرتی ذمہ داریاں، عورت کو غلام بنانے والی آئیڈیالوجی اور روایات کے خلاف تمدنی جدوجہد کی تنظیم سازی‘‘۔

معاشی میدان میں سوویت عورت نے شان دار کامیابیاں حاصل کیں۔اس نے برابر کی اجرتیں حاصل کیں اور بڑے پیمانے پر پیداوار میں شریک رہی۔اس بنیاد پر اس نے قابلِ ذکر سماجی وسیاسی اہمیت حاصل کی۔ وہ مختلف علاقائی اور مقامی سوویتوں (لوکل باڈیز) کی ممبر تھیں اور یوایس ایس آر کی سپریم سوویت (پارلیمنٹ) میں سیکڑوں عورتیں بیٹھتی تھیں۔مزدوروں اور ملازمین میں عورتوں کا حصہ 50 فیصد تھا۔ روسی عورت نے دوسری جنگ عظیم میں بھی نمایاں حصہ لیا۔سوویت عورت نے خود کو ہوابازوں، اور پیراشوٹ ٹروپس کے طور پر بھی نمایاں کیا تھا۔(12)

بلوچستان کو 1948 میں جب پاکستان میں ڈال دیا گیا تو اس کے بعد سرکاری سطح پر مارشلائی ون یونٹی مرکزی حکومت نے جو کچھ بھی کہا، وہی حرفِ آخر ٹھہرا۔عورتوں کی اپنی جدوجہد البتہ جاری رہی اور ان کی ہم نوا سیاسی پارٹیاں پابندیوں اور دارورسن کی کمر توڑ آزمائشوں کے باوجود اس سمت جدوجہد کرتی رہیں۔

چنانچہ عورتوں نے اپنے کچھ مطالبات لیگل کوڈ کے وسیلے سے منوالیے۔عورتوں نے ووٹ کا حق حاصل کرلیا۔فیملی لاز آرڈی نینس 1961 میں منظور ہوا۔اس قانون کی رو سے عورتوں کو سرکاری طور پر یہ حق ملا کہ وہ زرعی زمین کی وراثت، اور اپنے حصے کی مالک بن سکیں۔دوسری شادی پہلی بیوی کی رضامندی سے مشروط ہوگئی۔شوہر کے لیے طلاق کو مشکل بنا دیا گیا۔عورتوں کو پہلی بار حق ملا کہ وہ طلاق کی ابتدا کرسکیں۔شادیوں کو رجسٹر کرنے کا نظام جاری ہوا۔

فیملی لاز کے استعمال کرنے سے تعلیم یافتہ اور باشعور شہری عورتوں کے حقوق کسی حد تک محفوظ ہوئے مگر اس لنگڑے اور نامکمل قانون نے بھی کوئی خاص سفر طے نہ کیا۔حتیٰ شہری علاقوں کے محنت کش طبقے کی عورتیں بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھا سکیں۔دیہاتی اور قبائلی بلوچ عورت کی حالت اسی طرح ہی رہی اس لیے کہ وہ سیاسی منظرنامے اور تنظیمی سرگرمی کے مراکز سے بہت دور تھی۔

ہم آپ سب نے ایران میں دادشاہ بلوچ کی سامراج دشمن اور شاہ مخالف ہیرو کے بطور شہرت سن رکھی ہے۔ وہیں ناز بی بی نامی ایک شان والی بلوچ گزری جس نے دادشاہ کے ساتھ بندوق اٹھالی اور ایرانی ظلم کے خلاف شاہ اور امریکہ کو چیلنج کیا تھا۔

ایوبی دور میں تنظیمی حوالوں سے دیکھا جائے تو یہاں دو طرح کی خواتین تنظیمیں وجود رکھتی تھیں: ایک طرف خیرات کرنے والی بورژوا عورتوں کی تنظیمیں تھیں تو دوسری طرف ایسی تنظیمیں موجود تھیں جنھیں جمہوری عورتیں چلاتی تھیں۔اول الذکر تنظیموں کے اندر مشہور تنظیم اپوا تھی (آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن)' جب کہ دوسری قسم کی تنظیموں میں قابلِ ذکر تنظیم (ڈی ڈبلیو اے) یعنی ڈیمو کریٹک ویمنز ایسوسی ایشن تھی۔ دونوں تنظیموں میں بنیادی فرق موجود تھا۔ اپوا بالائی طبقات کی عورتوں کی انجمن تھی جبکہ ڈی ڈبلیو اے کے ممبروں میں وسیع طبقاتی پس منظر والی عورتیں شامل تھیں۔

ڈیموکریٹک ویمنز ایسوسی ایشن 1948 میں لاہور میں قائم کی گئی۔اس کا معین ایجنڈہ تھا۔اس نے امن، ترقی، خوش حالی، جمہوریت اور آزادی کو اپنا منشور بنالیا۔اس نے عورت کو دوہری غلامی سے نجات دلانے ،فرسودہ اور دقیانوسی فیوڈل خیالات اور لایعنی تعصّبات سے نکالنے کے لیے محنت کش عورتوں کو منظّم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔اس کی ایک شاخ 1969 میں کراچی میں قائم کی گئی۔ ڈی ڈبلیو اے دراصل 1945 میں ہونے والی عالمی تنظیم کی پاکستانی شاخ تھی۔اس کی نظریاتی اساس مارکسزم تھی۔ یہ تنظیم مزدور عورتوں میں بھی کام کرتی رہی۔یہ فیکٹری، ریل اور مچھلی کی صنعت سے وابستہ مزدوروں کی طرف خصوصی توجہ دیتی تھی۔ ڈی ڈبلیو اے کے پروگرام میں مساوی کام کے لیے، عورتوں اور مردوں کے لیے مساوی معاوضہ کے مطالبات شامل تھے۔اس تنظیم نے صرف عورتوں کے حقوق کی ہی بات نہ کی بلکہ اس سے بڑھ کر ایک سوشلسٹ نظام کے قیام کی تگ و دو بھی کی۔ ایسوسی ایشن عورتوں کو سیاست میں لانا چاہتی تھی۔اس نے بورژوا عورتوں کی نمائشی اور ٹوکن سیاست کے مقابلے میں محنت کش اور شہری متوسط طبقوں کی کارکن عورتوں کو سیاست میں بھرپور انداز میں شرکت کرنے کی وکالت کی۔

1954 میں ڈی ڈبلیو اے پر بھی وہی بجلی گری جو کہ یہاں پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی اور اس کی دیگر دوست تنظیموں پر گری تھی۔سب کچھ ممنوع قرار پایا۔عورتوں کی تنظیم جو پہلے ہی چٹائی پہ پڑی تھی، اب تو زیرِ خاک ہوگئی۔مگر تنظیمی شناخت وساخت کھو دینے کے باوجود ان تمام عوامی تنظیموں نے زبردست طور پر ایوبی آمریت کا مقابلہ کیا۔اگر کمیونسٹ پارٹی اور اس سے وابستہ عوامی

تنظیمیں نہ ہوتیں تو نہ کراچی کے بڑے جلوس ممکن ہوتے، نہ کسان کانفرنسیں منعقد ہو پاتیں، اور نہ عوامی مزاحمت منظّم ہو پاتی۔

ذوالفقار علی بھٹو آدھے ملک کا نیم مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا تو اُس نے ہر مقبول نعرے کو اپنے حق میں استعمال کیا۔ بڑے بڑے لوگ اُس کی پارٹی میں بھرتی ہو گئے۔ بھٹو صاحب ہر شخصیت ہر نعرے اور ہر ''ازم'' کو اُس کے لباس سے بے نیاز کرتا چلا گیا۔

بہر حال 1973 کے آئین نے عورتوں کو کچھ حقوق ضرور دیے۔ عورتیں نوکریوں میں آئیں، کالجوں میں لڑکیوں کی تعداد ذرا سی بڑھ گئی، اور ایک آدھ سیاسی عورت کے بیان بھی اخبارات میں نظر آنے لگے۔

1970 کی دہائی بلوچستان کے اندر عورتوں کے لیے مثبت و منفی دونوں امکانات لائی۔ خود اندرونی طور پر بے شمار تبدیلیاں واقع ہوئیں اور پڑوس میں بھی زبردست واقعات ہوئے جنھوں نے بلوچ عورت پر زبردست اثرات ڈالے۔ اسی دہائی میں ون یونٹ ٹوٹا اور بلوچستان علیحدہ صوبہ بنا۔ بلوچستان یونیورسٹی قائم ہوئی، بولان میڈیکل کالج وجود میں آیا، ریڈیو کے بعد ٹیلی ویژن کا آغاز ہوا۔ بہت سے بڑے اخبارات کوئٹہ سے بھی شائع ہونے لگے۔ عورتوں کی زندگی میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ علم کے دروازے کھلے، علمی ثقافتی اداروں میں اُس کا اندراج ہوا اور خود اس کی اپنی زندگی اور اس کے مسائل پر بے شمار تحقیقی کام ہونے لگا۔

ضیاالحق جب اپنے ہٹلری، رجعتی گھڑ سواروں کے ساتھ آیا تو اس نے تو گویا پورے سماج کی ہر ہر رگ کاٹ ڈالی، اُس کا ہر ہر ریشہ اکھاڑ پھینکا۔ اس کی پوری فسطائی مارشل لا گیری، اور اس کے پورے جہاد کی آفت بالآخر عورت کی ذات پہ آن گری۔ اسمبلی سیٹ اُس کی ختم ہو گئی، گواہی اُس کی آدھی رہ گئی، سنگسار وہ ہو گئی، چادر کی تاریکی اور چار دیواری کی قید اُس کا بھاگ بنے، اس کے، کھیلوں پر پابندی لگ گئی۔ آرٹ، کلچر اور تخلیق سب کے نرخرے کاٹ دیے گئے............ اور پیدا ہوئے مولوی بجلی گھر، عورت ہوئی در بہ در۔ ڈنڈا اور سوٹی عورت کی پیشانی کا لکھا بن گئے۔ مارشل لا ڈنڈا، مالک ڈنڈا، شوہر ڈنڈا حتیٰ کہ اپنی اولاد، اپنا بیٹا بھی ڈنڈا۔ سماج میں سے خیر و برکت

بخارات بن کر اڑ گئے۔ تلچھٹ میں غیرت و روایت کی سیاہ رات رہ گئی جو گو کہ گیارہ برس تک جاری رہی مگر اثرات ایسے قائم کر گئی کہ پچاس، ساٹھ برس تک زندگی کے ہر شعبہ پہ ضیاالحق بتیسی دکھائے ڈائن کی طرح ہر تخلیقی تفریحی سرگرمی کا دل نکالنے موجود رہے گا۔ اس کی کاشت کی ہوئی ریاستی مذہبی بنیاد پرستی کا بیج اب ایک ڈراؤنا دیو ہیکل درخت بن گیا۔

یہیں سے عورتوں پر تشدد کے راستے کھلے، یہیں سے جہیز پہ قتل، جنسی ہراس، پولیس، آرمی، مجسٹریٹ اور دیگر طاقت ور اداروں اور افراد کی طرف سے عورتوں کی زور زنائی کے واقعات روز کا معمول بن گئے ہیں۔ اور یہ سیاہ بامی شاید ابھی بہت دیر تک جاری رہے گی۔

حوالہ جات

1۔لیوس برنارڈ،دی امرجنس آف ماڈرن ٹرکی،آکسفورڈ پریس،1965،صفحہ 55

2۔لیوس برنارڈ،دی مسلم ڈسکوری آف یورپ،ویڈنفیلڈ اینڈ نکلسن،لندن 1982،صفحہ 182

3۔ایضاً،صفحہ 183

4- کماری جے وردنیا،''فیمنزم اینڈ نیشنل ازم ان دی تھرڈ ورلڈ''،1994،اثر پبلیکیشن لاہور، صفحہ 30

5۔لیوس،1965،صفحہ 231

6۔جے وردھنے،صفحہ 32

7۔میکڈونالڈ، لیزا، women's Liberation fight for Socialism-Links-2000(15)،70ء

8- لتھرا، بملا''نہرو اینڈ دی پلیس اف ویمن اِن انڈین سوسائٹی''درنندا، آر، بی کی کتاب''انڈین ویمن فرام پردہ ٹو ماڈرنٹی،نیو دہلی 1976،صفحہ 5 کے اندر

9-مولانا عبداللہ''زرِولور''سالنامہ''الحنیف'،ماہ مارچ 1938 جیکب آباد،صفحہ 68

10-بلوچستان آرکائیوز،فائل نمبر (1932) XX III-3050

11- سالنامہ''الحنیف''ماہ مارچ 1938،جیکب آباد،صفحہ 40

12۔سیموں ڈی بووار/یاسر جواد،''عورت''1999،فکشن ہاؤس،لاہور،صفحہ 176

پڑوس کی تبدیلیوں کے اثرات

افغانستان

1970 کی دہائی کا آخری نصف بلوچستان کے اڑوس پڑوس میں زبردست تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔اور ان میں سے سب سے بڑی اور مثبت تبدیلی تو افغانستان میں خلق پارٹی کا برپا کیا ہوا انقلاب تھا۔اس انقلاب نے بلوچستان کی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا۔اور ایک پروگریسو اور روشن خیال فلسفہ کی باتیں عملی صورت کا روپ دھارنے لگیں۔عورتوں کے بارے میں خصوصاً نئے احساسات اور نئے خیالات پیدا ہوئے۔بالخصوص بلوچستان کے طلبا، دانش وروں اور محنت کشوں پہ اس انقلاب نے بہت زبردست اثرات ڈالے۔

یہاں ہمیں،ثور انقلاب کی حاصلات سے قبل مختصر طور پر امان اللہ خان(1919-1929) کا ذکر کرنا چاہیے جو فروری 1919 میں افغانستان کے تخت پر بیٹھا تھا۔ترکی اور مصر کی طرح امان اللہ خان نے بھی اپنے ملک کو ماڈرن بنانا شروع کیا۔یہ روایت کے خلاف ناقابلِ جیت جنگ تھی۔1921 میں اس نے سوویت یونین سے ایک معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے''مشرق کی اقوام کی آزادی'' کی بات کی،اور کئی داخلی اصلاحات کیں۔جن میں قبائلی لیویز کا نظام بدلنے اور لیگل اصلاحات شامل تھیں۔اس نے 1923 میں ایک نیا آئین تجویز کیا جس میں

کہ ایک قومی اسمبلی ہونی تھی اور عورتوں کو ووٹ کا حق حاصل ہونا تھا۔(اس معاملے میں وہ کمال اتاترک سے بہت آگے تھا)۔اس نے اعلان کیا کہ،''عورتوں کی آزادی نئے افغانستان کے سماجی ڈھانچے کا ایک اہم ستون ہوگی''۔اُس نے بچپن کی شادی پر پابندی لگادی۔گرلز سکولوں کی حوصلہ افزائی کی اور کچھ افغان بچیوں کو تعلیم کے لیے ترکی بھیج دیا۔اس نے سرکاری اہلکاروں پر پابندی لگا دی کہ وہ ایک سے زائد شادیاں نہیں کر سکتے۔غازی امان اللہ خان نے فرمان جاری کیا کہ آئندہ عورتیں برقع نہیں پہنیں گی۔(1) خود 1928 میں اس کی بیوی ملکہ ثریا پبلک میں بغیر برقع کے نمودار ہوئی۔

ایک فوجی کودتا میں امان اللہ خان کا تختہ 1929 میں الٹا گیا اور اسے ملک بدر کیا گیا۔نو ماہ تک حکمرانی ایک تاجک ''بچہ سقاؤ'' نے کی،اس نے،اور اس کے بعد کے بادشاہوں،فیوڈلوں اور پیشواؤں نے عورتوں کی خاطر اٹھائے گئے امان اللہ کے سارے اقدامات کو ختم کر دیا۔گرلز سکول بند کیے گئے،عورتوں کے ووٹ کا حاصل حق ختم کر دیا گیا اور برقع پہننا لازمی قرار دیا گیا۔

افغانستان میں ثور انقلاب سے قبل سیاسی اقتدار شاہی خاندان،سرداروں،اشرافیہ اور بیوروکریسی کے ہاتھ میں تھا۔وہاں پہ انسانی حیات سے وابستہ سارے مظاہر اور ساری چیزیں اپنی پیشانی پر طبقاتی مہر لیے تھیں۔بچی کو کوئی اہمیت نہ تھی،اُسے کم عمری میں بیاہ دیا جاتا تھا۔کئی دفعہ چھوٹی بچی قلیل رقم اور حقیر اغراض کی خاطر شادی کے نام پر ایسے مرد کو فروخت کر دی جاتی تھی جو اس کے دادا کی عمر کا ہوتا تھا۔کئی بار فیوڈل اپنے قرض اور سود کے بدلے میں بے بس کسانوں کی بیٹی فروخت کر دیتے تھے۔

افغانستان،عورتوں کے لیے ایک دھکتے دوزخ کی مانند تھا۔کئی بار یہ دیکھا گیا کہ نوجوان لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر لڑکے کی تنگ دستی نے اُسے اس قابل نہ کیا کہ وہ اپنی محبوبہ کو حاصل کرتا۔لڑکی کا باپ اُسے زبردستی کسی اور کو فروخت کرتا''۔(2)

یہ پس منظر تھا جب وہاں بڑی شان والا انقلاب برپا ہوا اور عورتوں کے بارے میں نعتیں لیے عورتوں کا فرمان جاری ہوا جسے ''ہفتم نمبر فرمان'' کہا جانے لگا۔

اس فرمان نے مرد اور عورت کے درمیان موجود پدرسری،فیوڈل اور غیر عادلانہ رشتوں کو دفع کرنے اور خاندان کے درمیان اچھے روابط اور بہبود بخشنے والے کام شروع کیے۔اس اہم ترین فرمان کے نکات یہ تھے:

* کوئی شخص نقد پیسہ یا اجناس کے عوض اپنی بچی کی منگنی یا شادی نہیں کر سکے گا۔

کوئی شخص شادی کے وقت داماد کو لب (ولور) یا دیگر اخراجات اور مصارف کے نام پر نقد یا اجناس کی صورت میں ادائیگی پہ مجبور نہیں کر سکے گا۔

* کوئی شخص عید،نوروز،برات اور دیگر ناموں سے داماد کو پوشاک اور دیگر تحفوں کا انتظام کرنے پر مجبور نہیں کر سکے گا۔
* بیٹی یا اس کا اختیار دار،مہر کے نام سے دس شرعی درہم سے زیادہ رقم یا اجناس نہیں لے سکے گا۔
* منگنی اور شادی طرفین کی مکمل رضامندی سے ہی ہو سکے گی،اس لئے:

- کوئی شخص جبری شادی کا اقدام نہیں کر سکے گا۔
- کوئی شخص یہ نہیں کر سکے گا کہ قبیلہ اور برادری کے رشتے اور نزدیکی کی خاطر لڑکی یا بیوہ کو زبردستی نکاح میں لے لے۔

* لڑکی کے لیے شادی کی عمر 16 سال اور لڑکے کے لیے 18 سال ہے۔اس عمر سے پہلے شادی کی اجازت نہیں ہے۔(3)

جیسے کہ ہم جانتے ہیں سماجی قوانین محض فرمانوں کے ذریعے نافذ نہیں کیے جا سکتے،انھیں عوام کے اندر مقبول بنانا ہوتا ہے۔چنانچہ انسان کی بہتری کے ان قوانین کے فوائد کے بارے میں لوگوں کو شعور دینے کے ہر ممکن ذرائع استعمال کیے گئے۔ریڈیو ٹی وی،اخبارات،سیمینار،پمفلٹ اور جلسہ وجلوس الغرض ہر طریقہ استعمال کیا گیا۔اُس زمانے میں وہاں سے شائع ہونے والے بلوچی ہفت روزہ ''سوب'' کا ایک اداریہ یوں تھا:

”یہ بات واضح ہے کہ انسان کا مقام پیسہ سے بہت بلند ہے۔مگر افسوس کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو جانتے بوجھتے یا انجانے میں اپنی بیٹیوں کو فروخت کرتے ہیں۔

”سابقہ دور میں ظالم حکومتیں، جن کا واحد مقصد ظلم وستم اور جبر سے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنا تھا، دوسری ناروائیوں کے ساتھ ساتھ، یہ نہیں چاہتی تھیں کہ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں۔

”اب جب کہ افغانستان کی ڈیموکریٹک ریاست نے دیگر انسانی خواہشات کے ساتھ ساتھ افغانستان میں مرد وزن کے حقوق کی برابری قائم کرنے اور فیوڈل نارواانظام کے تعلقات کو ختم کرنے کے لیے ”ہفتم نمبر“ فرمان صادر کیا تو یقیناً گھریلو اور خاندانی رشتے بہت محبت اور دوستی کے ہوسکیں گے اور وہ ایک دوسرے کو احترام کی نظر سے دیکھیں گے۔

”ہفتم نمبر فرمان کا دفاع دراصل بچیوں کو کرنا ہے۔ظاہر ہے کہ ہمارے سماج میں گذشتہ ادوار میں لڑکیاں زیادہ حیثیت اور وقار کی مالک نہ تھیں اور انھیں مویشیوں کی طرح فروخت کیا جاتا تھا۔مگر ثور انقلاب سے ہماری زندگی کے سارے پہلوؤں (سیاسی، معاشی، سماجی اور رسم و رواج کے شعبوں) میں بڑے پیمانے پہ تبدیلی آئی۔ثور انقلاب کے بعد بہت ہی کم وقت میں جاری ہونے والے سارے فرمان، وطن کے سارے عوام کی زندگی کی بہبود کی خوش خبری دیتے ہیں“۔(4)

افغانستان کی انقلابی حکومت نے آتے ہی بہت سی خواتین کو اعلیٰ حکومتی عہدوں پر متعین کیا۔ان میں سے اہم ترین خاتون اناہیتا راتب زاد تھی۔چوں کہ اناہیتا کی والدہ ایک شہزادے کی نرس رہ چکی تھی، اس لیے اناہیتا کو سکول جانے کا موقع ملا تھا۔اس نے 1945 میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔پھر وہ نرسنگ پڑھنے امریکہ چلی گئی۔واپسی پہ اسے کابل کے زنانہ ہسپتال میں نرسنگ انسٹرکٹر اور پھر ڈائریکٹر بنا دیا گیا۔اناہیتا 1965 میں پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہوگئی۔(5)

یہ بات نہیں کہ پڑوسی افغانستان میں عورتوں کی اپنی کوئی تحریک نہ تھی۔یا انھیں مفت میں بیٹھے بیٹھے یہ حقوق ملے تھے۔بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اپنے حقوق کے لیے انھوں نے سخت حالات کا بہادری سے مقابلہ کیا۔1968 میں پارلیمنٹ کے قدامت پرست ارکان کی طرف سے افغان

لڑکیوں کے حصول تعلیم کے لیے باہر جانے پہ پابندی لگانے کی تحریک کے خلاف سیکڑوں عورتوں نے جلوس نکالے۔اسی طرح 1970 میں جب دو ملاؤں نے لیڈی ٹیچرز اور سکول طالبات کے منی سکرٹ پہننے پر ان کی ٹانگوں پہ گولیاں چلانے اور تیزاب پھینکنے کا اعلان کیا تو اس کے ردِعمل میں پانچ ہزار لڑکیوں نے جلوس نکالا۔(6) اناہیتا عورتوں کی اس تحریک میں شامل رہی۔1976 میں وہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی ممبر اور پھر ثور انقلاب کے نتیجے میں وزیر مقرر ہوئی۔نور محمد ترہ کی کی حکومت میں دوسری بااثر عورتوں میں سلطانہ امید (کابل گرلز سکول کی ڈائریکٹر)، ثریا (افغان ویمنز ڈیموکریٹک آرگنائزیشن کی صدر)، روح افزا کامیار (افغان ویمنز ڈیموکریٹک آرگنائزیشن کی ووکیشنل ہائی سکول کی پرنسپل)، فوزیہ (افغان ہلال احمر کی ڈائریکٹر)، دل آرا مارک اور پروفیسر آر ،ایس صدیقی شامل تھیں۔

پھر ہم نے دیکھا کہ افغانستان میں ردِ انقلاب نے زور پکڑنا شروع کردیا۔فوراً ہی انقلاب دشمن گرم ہواؤں کی زد میں آکر افغان انقلاب کا یہ حسین پھول مرجھانا شروع ہوگیا۔پارٹی کی ایکتا اور وحدت کو ڈائنوں کی نظر لگ گئی۔جب انقلاب دشمن تھپیڑے زیادہ دردانگیز ہونے لگے، تو اصلاحات پہ نظرثانی ہونے لگی اور اناہیتا راتب زاد کو سفیر بنا کر باہر پھینک دیا گیا۔اس دوران حفیظ اللہ امین پہ اپنے لیڈر کو قتل کرنے کا دھبہ لگا۔دودھ بھرے کٹورے میں مکھی تو گر چکی تھی۔جلد ہی سوویت فوجیں یاروں کے زخم بانٹنے پہنچ گئیں۔معاملات میں کچھ بہتری آئی۔پارٹی میں خواتین رہنماؤں کی دوبارہ بحالی ہوئی۔سرکار نے عورتوں کی جمہوری تنظیم کی سربراہی میں جہالت کے خلاف جہاد شروع کیا تھا۔انقلاب بڑھتا رہا۔مگر اب کے پوری سرمایہ دار دنیا اس انقلابی حکومت کے خلاف صف آرا ہوگئی تھی۔امریکہ اس بڑے بیڑے کا کپتان تھا اور ضیاالحق کے اندھیروں کے راج نے اس پورے علاقے کو علم کی دل آویز کرنوں سے ڈر کر بھاگے ہوئے مہاجروں کا ’اگلا مورچہ بنا دیا۔ع:

ہائے ان لوگوں کے لئے جو عشاق کے معاملات میں مداخلت کرتے ہیں!!

(مست توکلی)

چنانچہ 1980 میں پارٹی نے اصلاحات والا اپنا پروگرام آہستہ کردیا۔افغانستان میں بہبود کے کاموں کے خلاف کیا کچھ ہوا، ہم انا پتا کی زبانی سناتے ہیں: رجعتیوں نے عورتوں کی ''لازمی تعلیم'' کے ہمارے اعلان کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ کرکے سارے لوگوں کو تعلیم کے خلاف کردیا۔حتیٰ کہ خود ہائی سکول کی لڑکیاں بھی سرکار کی مخالف ہوگئیں اور گلیوں کے اندر لڑائی شروع کردی۔ لازمی برقعہ پہننے اور مرد وزن کو جدا جدا رکھنے کے مطالبے ہوئے۔ ریموٹ، تو پاکستان اوراس میں موجود مہاجر کیمپوں کے ہاتھ میں تھا۔

افغان انقلاب کی ٹھنڈی ہوا کے اس مختصر سے جھونکے نے عورتوں کو صدیوں کی نیند سے ہڑبڑا کر جگا دیا۔ڈاکٹر نجیب کے وقت میں بہت سی عورتوں کو بڑے بڑے عہدوں تک لایا گیا۔اس کی قومی مصالحت کے بڑے پروگرام کے نتیجے میں پارٹی لیڈروں کو ذرا سا پیچھے کردیا گیا۔ بعد میں یہ انقلاب ہی تباہ ہوگیا۔عورتوں کا حال تو پھر وہی ہونا تھا جو اَب ہے۔

اِدھر اقوام متحدہ کا ادارہ افغان مہاجر کیمپوں میں مکمل طور پرنا کام ثابت ہوا۔ثور انقلاب سے بھاگے ہوئے بےقسمتوں کو پاکستان کے مہاجر کیمپوں میں جگہ دی گئی۔ پاکستان میں مفاد پرستوں کی روزی کھل گئی۔کیمپ، دبئی بن گئے۔لوٹ مچ گئی۔ ریڈ کراس، فرانس، سعودی عرب اور دیگر ''بل ادا کرنے والے ممالک'' سے لٹیروں کی تجوریاں کھلوادی گئیں۔ان کو ''انسانی ہمدردی'' کا گیت گانے کو کہا گیا۔ چنانچہ سکول، ہسپتال، ٹرانسپورٹ، قالین بانی، راشن، بسکٹ، دودھ، کمبل.......... ہر سوراخ سمجھو بقال کی دکان بن گئی۔

مگر ان کیمپوں میں جو سکول کھولے گئے، ان کے اندر لڑکے تو موجود تھے مگر بچیوں کی تعلیم کی طرف آنکھیں بند کردی گئیں۔وہاں کے روشن خیال انقلاب سے بھاگے ہوئے افغان، روایت پرست تھے.......... گرلز سکول انھیں منظور نہ تھے۔ اور اقوام متحدہ نے لڑکوں کے لیے 161 مڈل سکول کھولے مگر بدبخت لڑکی ذات کے لیے صرف دو سکول۔ چاروں کے چار ہائی سکول لڑکوں کے لیے تھے۔

ان لوگوں کے زبردستی مہمان بننے اور ضیاالحق و نصیراللہ بابر کی پناہ میں آجانے سے ہمارا

سماج بہت پیچھے چلا گیا۔ معاشرے میں ہتھیار، زورا زوری، غنڈہ گیری، بے رواجی اور ہڑا دھڑی شروع ہوگئی۔اوراس ساری افراتفری، مستی اور خرمستی کا نتیجہ عورتوں پر ظلم اور سختی کی شکل میں نکلا۔ اس لیے کہ سماج میں کسی بھی طرز کی بدنظمی میں سماج کے کمزور ترین عناصر کچلے جاتے ہیں۔افغانستان کے قدامت پرست سماج کی بے رحم اور بے فائدہ ہواؤں نے پاکستانیوں کو بھی خوب جھلسایا۔ ہم بہت پیچھے دھکیل دیے گئے، سیاسی طور پر بھی اور سماجی صورت میں بھی...........اللہ کی یہ ناراضگی ہم پہ ابھی تک جاری ہے۔

ایران

اسی دوران ہمارے دوسرے پڑوسی ملک ایران میں بھی ایک زبردست انقلاب آ گیا، جس نے ہمیں براہِ راست متاثر کیا۔ وہاں بادشاہی تخت عوام کی ایک طویل اور تکلیف دِہ تحریک کے نتیجے میں الٹ دیا گیا۔ یہ اِس خطے کی پوری تاریخ میں ایک بہت بڑی خوش خبری تھی۔

مگر بادشاہی نظام کی جگہ عوامی حکومت نے نہ لی بلکہ ملّاؤں کی حکومت قائم ہوگئی۔ بہتر ہوگا، اگر ہم خمینی کی اس تخت نشینی سے قبل ایران کے میں عورتوں کی تحریک کا مختصر جائزہ لیں۔

ایران میں زرتشت مذہب کے بارے میں تو سب کو معلوم ہے کہ یہ مذہب عورتوں کو جائیداد میں کچھ حصہ دیتا تھا اور اُسے مذہبی رسومات کی کچھ آزادی بھی حاصل تھی۔ زنانہ اولیاؤں کے کئی روضے موجود تھے۔

1840ء کی دہائی میں باب ازم یا بہائی ازم کی تحریک جوان ہوکر ابھری اور چھا گئی۔اس نے زیادہ سماجی انصاف کا مطالبہ کیا۔ بہائی مذہب نے تجارت کی آزادی اور شخصی جائیداد کے حقوق، ٹیکسوں میں کمی، عورت کے مقام کی بلندی، عورتوں کے خلاف تشدد کے استعمال کے خلاف اور انھیں زیادہ تعلیم دینے کے حق والی اصلاحات کرنے کی وکالت کی۔اس نظریہ کو ایرانی اقلیتوں، دانش وروں اور عورتوں میں اچھی خاصی پذیرائی ملی۔

البتہ، دنیا کے لیے اس تحریک کا سب سے بڑا عطیہ اس تحریک کی نام ور خاتون رہنما قراۃ العین طاہرہ (1817-52) تھی۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر اور عظیم عالم تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران میں دولت اور اقتدار مذہبی پیشواؤں کے پاس تھا۔ یہ ملاّ ملکی امور میں بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ طاہرہؔ مذہبی لیڈروں کے ساتھ دانش ورانہ بحثوں میں حصہ لیتی تھی۔ وہ رجعت پسندی، قدیم رسوم و رواج، جاگیر دارانہ نظام اور عورتوں کی مظلومیت کے خلاف ڈٹ گئی، اور حقوق میں عورت و مرد کی مکمل مساوات کے حق کی مبلغہ بنی۔ قراۃ العین طاہرہ ایک سے زیادہ شادیوں کی سخت مخالف تھی۔ وہ پردے کے بھی خلاف تھی، اور خود عوامی اجتماعات میں بغیر پردہ کے آتی تھی۔ طاہرہ نے کھلم کھلا کثرتِ ازدواج کے خلاف، اور عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف تقریریں کیں۔ اس نے اپنے عزیزوں اور حتیٰ کہ شوہر تک کو چھوڑ دیا اور ایک ہول ٹائمر کے بطور بابی تحریک کے لیے ہمہ وقت کام کرنے لگی۔ وہ عوامی اجتماعات میں ''باب ازم'' کے لیے تقریریں کرتی تھی۔ اور پھر جب لڑائی کی نوبت آتی تو وہ میدانِ جنگ میں لڑتی تھی۔ یوں جنگ میں جب وہ گرفتار ہو کر محل پہنچادی گئی تو بادشاہ اُس کے حسن سے دنگ رہ گیا۔ وہ اس کی شان، دبدبہ اور نسوانی حسن سے مغلوب ہو گیا۔ اُس نے اسے بچانے کے لیے ایک شرط رکھی: اس سے شادی کرنے کی فرمائش کر دی۔

مگر نظریہ کی مالکن قراۃ العین طاہرہ کا جواب تھا:

تو وو ملک و جاہِ سکندری
من و رسم و راہِ قلندری
اگر آن نیکو ست تو در خوری
وگر این بداست مرا سزا (7)

بالآخر مظلوم عوام کو حقوق دلانے کی جدوجہد کی پاداش میں، اور بادشاہ کے ساتھ شادی سے انکار کے جرم میں قراۃ العین طاہرہ کو 1852 میں قتل کیا گیا۔

ذرا بعد میں دیکھیے تو شاہ نصر الدین (1848-96) کے با اثر وزیر مرزا تکی خان کے دور میں ایران میں کچھ لبرل اصلاحات ہوئی تھیں۔ خود مرزا، ترکی میں لبرل تحریکوں سے متاثر ہوا تھا۔

اس نے فوج کی اصلاح کی، پہلا فارسی اخبار قائم ہوا۔ تہران میں اولین پولی ٹیکنیک کالج کھلا، سڑکیں بنیں، پوسٹل نظام اور ٹیلی گراف قائم ہوئے۔

مگر ظاہر ہے ایسی اصلاحات کچھ حلقوں میں زبردست اندیشے پیدا کرتی ہیں۔ نتیجہ؟ تقی خان قتل ہوا۔ قدرت دیکھیے کہ یہی وہ وقت تھا جب ترکی میں بھی اصلاحات والی تحریک ناکام ہو گئی اور وہاں سلطان حمید مطلق العنان بادشاہ بن گیا۔ ایران میں شاہ نصیر الدین نے بھی اس کی مثال اپنالی۔

اُس کے جانشین شاہ مظفر الدین (1896-1907) کے دور میں اصلاحات کے مطالبات پر مشتمل ہنگامے ہونے لگے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک یہ ہنگامے بادشاہی حکومت کے لیے سنگین خطرہ بن گئے۔ یہ تحریک بادشاہ کی مطلق العنان حکمرانی اور اس کے برطانوی اور روسی ایجنٹ ہونے کے خلاف تھی۔ 1906 اور 1909 کے زبردست ابھار دراصل بورژوا جمہوری انقلاب کے ابھار تھے۔ 1908 میں ترکی میں اور 1911 میں چین میں ایسی ہی تحریکیں پھوٹ پڑی تھیں۔ 1905 کا روس کا انقلاب ان ساری تحریکوں کا منبع اور باعث تھا۔

شاہ نے کئی لیڈروں کو گرفتار کیا، ڈنڈے چلائے، اور جھوٹے فتوے لگوائے مگر اس سب سے تحریک دب نہ سکی۔ بالآخر مجبور ہو کر اسے کچھ مطالبات تسلیم کرنے پڑے۔ جن میں قومی اسمبلی (مجلس) کے قیام کا مطالبہ بھی شامل تھا۔ اکتوبر 1906 میں پہلی اسمبلی نے آئین بنایا مگر بدقسمتی کہ اس پر دستخط کرنے کے پانچ دن بعد بادشاہ مر گیا اور آئین کا سخت ترین مخالف' اس کا بیٹا محمد علی بادشاہ بن گیا۔ اور ایک بار پھر دار و گیر کے حربے رواجِ امروز بن گئے۔

یہیں (1906 میں) عورتوں نے گلیوں اور سڑکوں میں جلوس نکالے، شاہ کی سواری کا گھیراؤ کر کے اُسے اپنے مطالبات پیش کیے۔ ایک عورت نے تو اُسے ایک خط دے دیا جس میں لکھا تھا: ''ڈرو، اس وقت سے جب ہم بالآخر تمہارے سر سے تاج اتار دیں گی اور تمہارے ہاتھ سے شاہی عصا چھین لیں گی''۔ عورتیں بغیر برقعہ کے تہران کی سڑکوں پر نعرے لگاتی مارچ کرتی تھیں: ''آئین زندہ باد، آزادی زندہ باد.........ہمیں پابندیوں سے خود کو آزاد کرنا ہے، ہمیں اپنی

مرضی سے زندگی گزارنی ہے''۔ مضحکہ خیزی دیکھیے کہ ان عورتوں کے بارے میں کہا گیا کہ، ''وہ رنڈیاں ہیں جنھیں رجعت پسندوں نے 1906 کے انقلاب کو بدنام کرنے کے لیے کرائے پر لیا ہے''۔(8)

شدید جدوجہد کے بعد حاصل ہونے والے 1906 کے اس آئین نے عورتوں کو نہ صرف یہ کہ ووٹ کا حق نہیں دیا، بلکہ الٹا انھیں گالی دی گئی۔ آئین کا آرٹیکل نمبر 10 کہتا ہے کہ: ''مندرجہ ذیل لوگوں کو ووٹ کے حق سے محروم کیا جاتا ہے' ساری عورتیں' کم سن لوگ......فراڈ کرنے والے، دیوالیہ لوگ، بھکاری، قاتل، چور اور دیگر جرائم پیشہ افراد''۔(9)

پھر جب قدامت پسند قوتوں نے آئینی حکومت کو تباہ کرنے کی کوشش کی تو عورتیں بھی مزاحمت میں شامل ہوگئیں۔ وہ سڑکوں پر نکل آئیں اور جدوجہد میں حصہ لیا۔ 1911 میں مجلس پر دوسرے حملے کے موقع پر عورتوں کی مزاحمت کے بارے میں لندن ٹائمز نے لکھا:

''محبِّ وطن جلوس جاری ہیں۔ ایک حیران کن بات اِن جلوسوں میں عورتوں کی نمایاں طور پر شمولیت والی ہے۔ بڑی مسجد میں عورتوں کا بہت بڑا جلسہ ہوا..........عورت مقرروں نے تقریریں کیں''۔(10)

ایک اور موقع کے بارے میں ملاحظہ ہو:

''چار دیواریوں اور حرموں سے تین سو عورتوں نے مارچ کیا..........اکثریت کے پاس (آستینوں اور نیفوں میں) پستول تھے۔ وہ سیدھا پارلیمنٹ تک گئیں اور وہاں جمع ہوگئیں۔ وہ صدر کے مقابل ہوئیں۔ دھمکی میں اُسے اپنے پستول دکھائے، اپنے برقعے پھاڑ ڈالے اور اپنا فیصلہ دیا کہ اگر اسمبلی کے ممبر قوم کی آزادی کی حفاظت کرنے کے اپنے فریضے سے اِدھر اُدھر ہوجائیں تو وہ اپنے شوہروں اور بیٹوں کو قتل کر کے خود اپنی لاشیں چھوڑ جائیں گی۔(11)

آیئے دلچسپ باتیں دیکھیں۔ ہم سو سال قبل کی بات کر کے دیکھتے ہیں کہ سو سال بعد معاشرے میں کیا کوئی تبدیلی ہوئی یا ہم ابھی تک وہی کھڑے ہیں؟

1911 میں جب آئین پر بحث ہو رہی تھی تو حاجی وکیل الرویا نے پارلیمنٹ میں تجویز

پیش کی کہ عورتوں کو ووٹ کی اجازت دی جائے۔ اس نے سوال کیا کہ عورتوں کو ووٹ سے کیوں محروم کیا جا رہا ہے؟۔ کیا وہ انسان نہیں ہیں اور کیا انھیں وہی حقوق حاصل نہ ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں؟۔

شیخ اسد اللہ نے جواب دیا؛ ''ہمیں اس معاملے پر بحث نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ یہ اسلامی پارلیمنٹ کے آداب کے خلاف ہے۔ عورتوں کو ووٹ سے محروم کرنے کا سبب یہ ہے کہ خدا نے انھیں سیاست میں حصہ لینے کے لیے ضروری اہلیت نہیں دی''۔(12)

(آج بھی ہماری پارلیمنٹ میں، چائے خانوں اور شادی غم کی محفلوں میں یہی باتیں ہو رہی ہیں)۔

ایران میں عورتوں کی تحریک کسی نہ کسی صورت جاری رہی۔ بیسویں صدی کے اوائل کے شاعر محمد ہاشم مرزا امسارا کا کلام ملاحظہ ہو:

تمہارا بایاں ہاتھ دائیں سے ادنیٰ نہیں ہے
اگر اس سے کام لیا جاتا تو یہ دائیں سے زیادہ مضبوط ہو جاتا
اگر عورت مرد کی طرح نہیں ہے تو یہ تمہارا قصور ہے
ہمیں عورتوں کے لیے تعلیم اور آرٹ کا مطالبہ کرنا چاہیے

اسی طرح مشہور شاعر ابوالقاسم لاہوتی نے عورت کے حسن کے کلاسیکل نظریہ کو رد کر دیا اور عورت کا ایک نیا تصور دے دیا: ''میں کسی ایسی عورت کے حسن کی تعریف نہیں کرتا جو کہ ان پڑھ ہو، مجھے مزید اپنے حسن سے نہیں بلکہ اپنی کارکردگی دکھا کر مسحور کرو''۔

لاہوتی نے اس زمانے کے دیگر شعرا کے ساتھ مل کر برقعہ کے خلاف مہم چلائی:

''او..........اٹھا دو برقعہ..........میں، سماج میں تمھیں آزاد دیکھنے کا متمنی ہوں!''

یہی بات شاعر عشقی نے کہی:

اگر دو یا تین مقرر میرے ساتھ اپنی آواز ملا دیں

(تو) ملک میں ایک ایجی ٹیشن شروع ہو جائے
اور اس ایجی ٹیشن سے عورتوں کے چہروں سے برقعے ہٹ جائیں گے
سماجی زندگی سے مسرت ملے گی
وگرنہ جب تک اس کفن میں عورتیں اپنا سر چھپائیں گی
فارس کی قوم کا نصف حصہ مرا ہوا رہے گا! (13)

1922 میں وہاں ایک روشن فکر پارٹی کے دوبارہ احیا کی کوشش کی گئی اور اس نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کی۔ اس پارٹی نے عورتوں اور نوجوانوں کی سوسائٹیاں قائم کیں، ٹریڈ یونین اور ثقافتی گروپ بنا لیے۔ عورتوں کے سیکشن کے روابط کلارا زیٹکن کی کمیونسٹ ویمنز انٹرنیشنل (1920 میں قائم کردہ) سے تھے جس کی کمیٹی میں ایک ایرانی عورت دسوادسادے بھی شامل تھی۔

مگر رضا خان کے 1925 والے جبر و استبداد نے پارٹی کو کمزور کیا۔ 1931 میں کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگا دی گئی اور ظلم و ستم شروع ہوا۔ کئی عورتیں جیل میں پھینک دی گئیں، جن میں جمیلہ صادقی اور شوکت روستہ شامل تھیں۔ 1932 میں تکی آرانی اور دیگر طالب علموں نے بیرونی ممالک کی روشن خیالی سے متاثر ہو کر 53 دانش وروں پر مشتمل ایک سٹڈی گروپ قائم کیا۔ انھیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر کچھ نے بعد میں دیگر لوگوں سے مل کر تودہ پارٹی بنالی۔ (14)

اسی دوران شاہ نے عورتوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنے برقعے اتار پھینکیں۔ جس سے ملّا سخت ناراض ہوئے۔ کہتے ہیں کہ 1928 میں ملکہ قم کے ایک روضے میں اس طرح نمودار ہوئی کہ اس نے مروجہ سیاہ چادر کے بجائے ایک باریک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ ملاؤں نے اس پر اُس سے بدتمیزی کی۔

1934 میں لیڈی ٹیچروں اور سٹوڈنٹس کو حکم ہوا کہ وہ بغیر برقعہ کے نمودار ہوں۔ فروری 1936 میں چادر اوڑھنے پہ پابندی لگا دی گئی۔ سرکاری اہلکاروں کی عورتوں نے اگر چادریں پہنی ہوتیں تو انھیں سینماؤں اور دیگر پبلک مقامات پر داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔ اگر بس اور ٹیکسی ڈرائیور برقعہ والی مسافر بٹھاتے تو انھیں جرمانہ کیا جاتا تھا۔ (15)

1936 میں شاہ نے ایرانی عورتوں کو ووٹ کا حق دیا۔ ایران میں پروین اعتصامی، ژالہ اصفہانی، سیمیں دانش ور، فروغ فرخ زاد کے علاوہ شہلا ہاتری نے ایرانی خواتین کی زبوں حالی، غلامی اور سماجی پستی پر کڑی نکتہ چینی کی۔ شہلا ہائری نے "قانونِ خواہش" لکھ کر متعہ پر بھی تنقید کی۔ ایران میں انقلاب سے قبل خمینی، فرانس سے ایرانی خواتین کو شہنشاہ ایران کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے پر اکساتا رہا۔

ایران میں عورتوں کی حیثیت کے اسی پس منظر میں خمینی کا انقلاب ہوا۔ سماجی میدان میں یہ انقلاب انتہائی رجعتی اور بہت ہی بنیاد پرست طویل عرصے کی ابتدا ثابت ہوئی۔ عورتوں کے بارے میں نئی حکومت والوں کے خیالات بہت ہی قابلِ اعتراض تھے۔ آیت اللہ مرتضیٰ مطہری یوں کہتا ہے؛

"ایک شخص کہاں زیادہ مفید ہو سکتا ہے؟۔ ایک ایسی جگہ جہاں وہ مردوں کے اداروں میں پڑھے' یا وہاں، جہاں وہ ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہو جس کے سکرٹ سے اس کی رانیں نظر آئیں؟............ کون سا آدمی زیادہ کام کر سکتا ہے؟ وہ جو ہمیشہ فیکٹری، دفتر، بازار اور گلی میں میک اپ والے حسین اور ایمان چھیننے والے چہروں کو دیکھے۔ یا وہ آدمی، جسے ایسے نظارے نہ دیکھنے پڑیں؟"۔

یہ حکومت عورتوں کے خلاف قوانین کا ایک سلسلہ جاری کرتی رہی۔ اِن قوانین نے نہایت تیزی کے ساتھ سرکاری شعبے میں عورت کی رسائی کو محدود کر دیا۔ عدالتوں کی جج برخواست کر دی گئیں۔ بہت جلد دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر کر دیا گیا۔ ایران میں مرد کا قتل ایک سنگین جرم ہے، جب کہ عورت کا قتل کمتر درجے کا جرم۔ مرد اپنے "حرم کی خلاف ورزی" کرنے والی عورت کو قتل کر سکتا ہے۔ مرد اپنی بیویوں، بہنوں یا ماؤں کو زنا کے الزام میں قتل کر سکتا ہے۔ سیاسی طور پر بھی عورت برے حال میں ہے۔ آئین کی دفعہ 115 کے تحت "قوم کا لیڈر مرد ہوگا، صدر بھی"۔ (پاکستان جیسا بنیاد پرست معاشرہ بھی آئین میں ایسا نہیں لکھ سکتا)۔ حکومت نے لازمی حجاب رائج کرنے کے بعد لڑکوں لڑکیوں کے لیے یونیورسٹی کی کلاسیں علیحدہ کر دیں۔ سب سے

ڈرامائی تبدیلی عورت کی بلوغت کی عمر میں کمی تھی۔ لہٰذا لڑکیوں کی شادی کی عمر 10 برس کر کے اسے آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔ آیئے ہم ایران میں 1979 کے بعد عورت کی تحقیر کے اقدامات کو تاریخ وار دیکھتے ہیں:

مارچ 1979 میں آیت اللہ خمینی نے ساری عورت ججوں کو ڈسمس کر دیا اور برقعہ پہننے کا حکم دیا۔ مئی میں مخلوط تعلیم پر پابندی لگادی۔ جون میں شادی شدہ عورتوں کو سکول جانے سے منع کر دیا۔ جولائی میں ساحلِ سمندر کے تفریحی مقامات کو جنس کی بنیاد پر علیحدہ علیحدہ کیا گیا۔ المختصر ان لوگوں کے اقتدار میں آنے سے ایرانی عورتیں اپنے اُن تمام حقوق سے محروم ہو گئیں جو انھوں نے پوری ایک صدی کی جدوجہد سے حاصل کیے تھے۔ محض ووٹ کا حق ابھی تک انھیں حاصل ہے۔'' (16)

بہر حال 1970 کی دہائی کے آخری برسوں میں (افغان انقلاب کے مختصر اور محدود، مگر بہترین اثرات کی موجودگی کے باوجود) مجموعی طور پر پورے خطے کی طرح پاکستانی عورتوں کی تحریک پہ برے ایام مسلط رہے۔ خود بھٹو اپنی حکمرانی کے آخری ایام میں 180 زاویے کا پینترا بدل گیا تھا۔ حالاں کہ اسی موقع پرست پیپلز پارٹی نے بیگم بھٹو کی قیادت میں 1975 میں میکسیکو میں عورتوں کی عالمی کانفرنس میں شرکت کر کے ''میکسیکو ڈیکلریشن'' پر دستخط بھی کر دیے تھے۔

حوالہ جات

1- ہالی ڈے، فریڈ، "Revolution in Afghanistan" New left review Vol 112 (1978)

2- ترہ کی، نور محمد، ریڈیو تقریر ہفت روزہ ''سوب'' قوس 1357,29 کابل، صفحہ 2

3- ''ہفتم نمبر فرمان''، بلوچی ہفت روزہ ''سوب''، یکم نومبر 1978 کابل، صفحہ نمبر 1

4- اداریہ، بلوچی ہفت روزہ ''سوب'' یکم نومبر، 1978، کابل

5- ڈپرے، این ایچ "Revolution & Rebellions in Afghanistan"، 1984، صفحہ نمبر 314

6- ایضاً............صفحہ نمبر 310

7- کلارا، اے ایچ/شمشیر علی ''قراۃ العین طاہرہ''، ماہنامہ ''سپوتنک''

8- Bayet-Phillip "Women in the Muslim World" 1980 ہاورڈ یونیورسٹی پریس، کیمبرج، صفحہ 298

9- سنگھوی رامیش، آریا مہر ش The Shah of Iran: 1968............ لندن، صفحہ نمبر 300

10- بایٹ فلپ............Women in، صفحہ نمبر 303

11- سنگھوی اور دیگر: دی ریوولیوشن آف دی شاہ اینڈ دی پیپل، 1967، صفحہ نمبر 15

12- بایٹ فلپ............"Women in، صفحہ نمبر 301

13- جے وردھنا............صفحہ نمبر 63

14- ایضاً............صفحہ نمبر 67

15- سویوری، راجر "Iran udner the Pehlvi 1978" کیلیفورنیا، صفحہ نمبر 98

16- صالح افشار، "Reconstructing Fundamentalism as Feminism"............ بلٹن، 1995، شرکت گاہ، لاہور

ضیاالحق کا عورت دشمن عہد

ضیا حکمرانی میں ٹی وی پر خواتین اناؤنسر دوپٹہ سر پہ ڈال کر ٹی وی پہ اپنی نوکریاں جاری و ساری رکھنے میں کامیاب رہیں۔ ''پردہ''، ''حجاب' 'اور'' چادر اور چار دیواری'' جیسے اقتدار طویل کرنے والے الفاظ، ضیا کی ہر بے سود، بے نمک لمبی تقریر کے دل پسند الفاظ بنے۔ قانون، آئین، میڈیا، عدالت الغرض ہر جگہ رجعت پرست آ گیا اور اُس کے سارے فلسفہ کا سارا زور عورت کے خلاف پڑا۔ پہلے سے خوفزدہ جانور اب ایک دہشت زدہ لونڈی بن گئی۔

ضیاالحق 'ملک کے اندر رجعتی نکتۂ نظر کے علاوہ ، ایرانی بنیاد پرست حکمرانوں اور افغانستان میں خلق پارٹی کی حکومت کے مخالف مولویوں سے خوراک لیا کرتا تھا۔ یہ تکون ایک دوسرے کو سہارا دیتی اور مضبوط کرتی رہی۔ اسی زمانے میں افغانستان کے مولویوں کا ایک متفقہ فتویٰ آ گیا جسے بلوچستان میں وسیع پیمانے پر نقل اور شائع کیا گیا۔ ملاحظہ ہو:

''...........لیکن عورتوں کے سلسلہ میں طریقۂ تعلیم مختلف ہے۔ اسے اپنی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنی چاہیے اور اسے تعلیم حاصل کرتے ہوئے اپنے آپ کو پردے میں رکھنا چاہیے۔ عورت کو گھر میں رہ کر ایسے لوگوں سے تعلیم حاصل کرنی چاہیے جو اس کے لیے اجنبی نہ ہوں، مثلاً گھر کے افراد سے۔ اگر ایسے کوئی حالات نہ ہوں تو پھر وہ کسی اجنبی سے تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن شرط

یہ ہے کہ اس کے گھر کے افراد موجود ہوں اور اجنبی اُسے دیکھ نہ پائے......اگر کوئی مرد اپنی بیوی کو غیر ضروری طور پر باہر جانے کی اجازت دیتا ہے تو وہ دونوں گنہگار ہیں۔ کسی اجنبی شخص کو اجازت نہیں کہ وہ کسی اجنبی عورت کو دیکھے۔ اور اسی طرح کوئی اجنبی عورت، اجنبی مرد کو نہیں دیکھ سکتی۔ عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر یا خیمے میں رہے اور اپنی ظاہری اور باطنی ساخت کی حفاظت کرے۔ اگر اُسے کسی وجہ سے گھر سے نکلنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اسے چاہیے کہ مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرے:

''پرفیوم نہ لگائے، آنکھوں کو بھانے والا اور خوب صورت لباس نہ پہنے' نرم چپکے ہوئے کپڑے نہ پہنے' پازیبوں کی آواز نہ آئے۔ اپنی طرف متوجہ کرنے والے طریقے سے نہ چلے' نہ ہی سڑک کے درمیان میں چلے۔ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نہ جائے۔ اجنبی مردوں سے بات نہ کرے۔...........اجنبیوں کو محبت سے نہ دیکھے اور مردوں سے کوئی تعلق نہ رکھے۔

''عورت نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں نہیں جا سکتی ۔ عام طور پر عورت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ سکول جائے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سکول عورتوں کو مذہبی تعلیم نہیں سکھاتے' نہ وہ اُن کے غلط اطوار کو درست کرتے ہیں۔ باہر کا تمام کام مرد کو دیا گیا ہے اور مرد عورت کے لیے ضروریات مہیا کرتا ہے۔ تاریخ، جغرافیہ اور انگلش جیسے مضامین غیر ملکیوں کی نقل ہیں۔ سماجی زندگی میں ایک عورت کی شرکت درست بات نہیں ہے۔ چوں کہ 90 فیصد مرد بے روزگار ہیں اس لیے عورتوں کو ملازمت دینے کی ضرورت نہیں۔ عورتوں کا پڑھنا لکھنا کوئی اچھی بات نہیں اس لیے کہ اگر وہ پڑھنا لکھنا سیکھ لیں گی تو وہ ان مردوں سے رابطہ رکھیں گی جو اُن سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔

''ہم اعلان کرتے ہیں کہ عورتوں کو غیر ضروری طور پر باہر جانے اور سکول جانے کا حق نہیں''۔(1)

چوں کہ ایسی باتیں فیوڈل سماج کے مردوں کو بہت اچھی لگتی ہیں اور چوں کہ ہر سماج کے ماضی کا ایک بڑا حصہ عورتوں کی تذلیل میں گزرا ہوتا ہے' اس لیے ان پر عمل کرنا کچھ کم مقبول نہیں

ہوتا۔ ایسے اعلانات پر مرد بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر کوئی شخص، گروہ، پارٹی یا حکومت، مندرجہ بالا اعلان کی مخالفت میں کوئی بات کرے تو ایک قدامت پسند معاشرے میں اس کی مزاحمت ضرور ہوتی ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب ہندوستان کی حکومت نے ستی ایکٹ پاس کیا تھا تو ستی رواج کے کئی ہزار حامیوں نے جلوس نکالے۔ اس ایکٹ کو غیرت، رواج اور مذہب میں مداخلت قرار دیا گیا اور ہندوستان کی حکومت کو ہندو مذہب کا دشمن کہا گیا۔ آیئے دیکھتے ہیں:

''ستی کرنے والی عورت' روپ کنور کی تیرہویں پر آس پاس کے گاؤں سے ہزاروں لوگ آ گئے۔ حالاں کہ حکومت نے ساری بسیں بند کر دیں پھر بھی ڈھائی لاکھ افراد تیرہویں کی رسومات ادا کرنے جمع ہو گئے۔ روپ کنور کی اس رنگین تصویر کی تیس ہزار کاپیاں فروخت ہوئیں جس میں اُس نے اپنے مرے ہوئے خاوند کا سر، گود میں لیا ہوا ہے اور وہ شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔ روپ کنور اب ستی ماتا بن چکی تھی۔

''1987 میں روپ کنور واقعہ کے چشم دید لوگوں کا کہنا ہے کہ جب شعلوں نے اسے گھیر لیا تھا تو اس نے دونوں بازو ہوا میں لہرا رکھے تھے۔ ایک بڑے افسر نے اعلان کیا اس نے آگ کی تکلیف کی وجہ سے بازو نہیں اٹھائے ہوئے ہیں بلکہ مجمع میں موجود لوگوں کے لیے دعا کرنے کے لیے ایسا کیا۔ (سرکاری افسر برصغیر میں سب سے بڑا اخر دشمن کردار ادا کرتا رہا ہے)۔

''روپ کنور کو جب جلانے لایا جا رہا تھا تو اس کے گرد نوجوان راجپوت لڑکوں نے حلقہ بنایا ہوا تھا جنھوں نے ننگی تلواریں سونت رکھی تھیں تا کہ اس آفاقی جہاد میں کسی بھی قسم کی مداخلت سے اُس کی حفاظت کی جا سکے''۔ (اگر وہ ستی نہ ہونا چاہتی تو یہ تلوار بردار اُسے ایسا کرنے نہ دیتے)۔(2)

بالکل یہی صورت ہے دنیا بھر میں۔ عورتوں کے خلاف رواجوں کو تحفظ اور تقدس دینے کے لیے ننگی تلواریں لیے ہوئے راجپوت آپ کو ملیں گے۔ پیشوا، فیوڈل، دانشور، اور سرکار اپنے اپنے مورچوں پہ ڈٹ کر اپنے حلقۂ اثر کے لوگوں کو دھرم، رواج، اور نظریات کے حوالے سے اکساتے رہتے ہیں اور ایک ایسا ماحول بنا دیتے ہیں جہاں سے مست توکلی جیسے بہادر انسان کے

علاوہ کوئی اور فرار اختیار کر ہی نہیں سکتا۔

بلوچستان میں بھٹو کی 1970 کی دہائی والی فیوڈل جنگ نے پسماندہ بلوچ عورت اور اس کی بے دم تحریک کو مزید گہرے کھڈے میں پھینک دیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں بھٹو کا فیوڈل ازم پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو گیا۔ ایسی سیاسی پارٹیاں ویسے بھی عورتوں کے مسائل پر نظریاتی مباحث بہت کم کرتی ہیں۔ فلسطین کی پی ایل او کی طرح عورتوں کے بارے میں اُس کا رویہ محتاط بلکہ رجعت پسندانہ تھا۔(3)

18 دسمبر 1979 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے عورتوں کے خلاف امتیاز کے خاتمے کے لیے اقوام متحدہ کے کنونشن (CEDAW) کو تسلیم کیا۔ 3 ستمبر 1981 کو جب بیس ممالک نے اس پر رضامندی ظاہر کی تو یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ کی شکل میں وجود میں آ گیا۔ کنونشن کی دسویں سالگرہ کے موقع پر تقریباً ایک سو ممالک اس معاہدے پر دستخط کر چکے تھے۔ یہ معاہدہ کچھ یوں ہے:

کنونشن میں فریق ممالک، خواتین کے خلاف عدم مساوات کی مذمت کرتے ہیں اور بغیر تاخیر کے اور ہر ممکن طریقے سے خواتین کے خلاف تمام امتیازی رویے ختم کرنے کے لیے مندرجہ ذیل عہد کرتے ہیں:

* ملکی آئین کے ذریعے عورتوں اور مردوں میں مکمل مساوات کی ضمانت دینا اور اس مقصد کے لیے ضروری قانون سازی کرنا۔
* عورتوں کے ساتھ عدم مساوات کے خلاف تمام قوانین کا خاتمہ اور ان کی جگہ مناسب قانون سازی کرنا۔
* عورتوں کو قانون کے ذریعے مردوں کے ساتھ ساتھ مکمل حقوق دینا۔
* کوئی ایسی کارروائی نہ کرنا جس کا تعلق عورتوں کو غیر مساوی حقوق دینے سے ہو۔ اور اس بات کی ضمانت دینا کہ سرکاری مشینری اور ادارے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کام کریں گے۔

* کسی بھی ادارے، شخص یا تنظیم کی طرف سے عورتوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کے خلاف اقدامات کو روکنا۔

* ایسے قوانین، ضابطے، رسومات اور رواجوں کو ختم کرنا یا ان میں ترمیم کرنا جو عورتوں سے مساوی سلوک کے خلاف ہوں۔

* ایسی تمام تعزیرات کا خاتمہ جو عورتوں سے امتیازی سلوک کرتے ہوں۔

* فریق ممالک سماجی، اقتصادی اور سیاسی میدان میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے کے لیے ضروری اقدامات کریں گے۔

* حکومتوں کی طرف سے عارضی طور پر کیے گئے خاص اقدامات، جن کا مقصد عورتوں مردوں کے درمیان اصلی مساوات پیدا کرنا ہو' امتیاز'' نہیں سمجھے جائیں گے۔ کیوں کہ برابر مواقع ملنے پر یہ اقدامات ختم کر دیے جائیں گے۔

* فریق ممالک ایسے اقدامات کریں گے جن کا مقصد ایسے قوانین، رسومات اور تعصّبات کا خاتمہ کرنا ہے جو مرد یا عورت کو جنس کی بنیاد پر ایک دوسرے سے کمتر یا بہتر بناتے ہیں۔

* خاندان میں اس شعور کو یقینی بنانا کہ زچگی ایک سماجی عمل ہے اور یہ کہ بچوں کی پرورش اور تربیت مرد اور عورت کی ایک جیسی ذمہ داری ہے اور یہ سمجھنا کہ بچوں کی بھلائی ہی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

* تمام ممالک خواتین کے لیے سیاسی اور سرکاری سطح پر مہیا ہونے والے حقوق کی ضمانت دیں گے۔ ان حقوق میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

۔ تمام انتخابات اور ریفرنڈم میں ووٹ ڈالنے کا حق۔

۔ حکومت کی پالیسی سازی میں شرکت، سرکاری عہدہ حاصل کرنے اور تمام سرکاری کاموں میں حصہ لینے کا حق۔

۔ حکومتیں ایسے اقدامات کریں گی جس سے خواتین مردوں کے برابر، بغیر کسی

امتیاز کے، عالمی سطح پر ایسی حکومتوں کی نمائندگی اور عالمی تنظیموں میں شرکت کر سکیں گی۔

۔ حکومتیں ایسے تمام اقدامات لیں گی جن سے تعلیم کے میدان میں عورتوں کے خلاف امتیازی سلوک ختم ہو اور مردوں کے برابر مساوی حقوق مل سکیں۔

۔ تعلیم میں عورت اور مرد کے صرف روایتی کردار کو پیش کرنے کی سوچ کو، نصابی کتابوں پر نظر ثانی، سکول پروگراموں، مخلوط تعلیم اور نئے تدریسی ذریعوں سے ختم کیا جائے۔

۔ فریق ریاستیں خواتین کو بھی روزگار کے مواقع مردوں کے برابر مہیا کریں گی تاکہ خواتین بھی حقوق حاصل کر سکیں جو مردوں کو عام طور پر حاصل ہیں۔

خاص طور پر:

* برابر اجرت اور مراعات کا حق اور مساوی اصولوں کے تحت کام کا جائز حق۔ حمل کے دوران یا زچگی کے لیے تعطیلات کی بنا پر خواتین کی ملازمت سے برطرفی کی ممانعت۔

* زچگی کی تعطیلات تنخواہ کے ساتھ مراعات کے ساتھ اور ان تعطیلات کے دورانِ ملازمت سے برطرفی کے خطرے کی روک تھام۔

* والدین کو ایسی خدمات مہیا کرنا کہ وہ اپنے فرائض منصبی بھرپور طریقے سے ادا کر سکیں۔ خاص طور پر بچوں کی نگہداشت کا مضبوط پروگرام تشکیل دے کر انھیں کئی پریشانیوں سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔

* ایسے کام اور فرائض جو زچگی کے دوران عورت کے لیے نقصان دہ ہوں، ان سے اس کو تحفظ دینا۔

* حکومتیں وہ تمام اقدامات کریں جن کے ذریعے صحت کے میدان میں عورتوں کے خلاف امتیاز کو ختم کیا جاسکے اور انھیں مردوں کے برابر صحت کی سہولیات جن میں

خاندانی منصوبہ بندی شامل ہے، آسانی سے دستیاب ہوں۔

* کنونشن میں شریک ممالک کی حکومتیں خواتین کو دورانِ زچگی تمام ضروری سہولیات پہنچائیں گی۔ اگر ضرورت ہو تو یہ سہولیات، جن میں کھانا پینا بھی شامل ہے، مفت مہیا کی جائیں گی۔
* کھیلوں، تفریحی سرگرمیوں اور تمام ثقافتی امور میں حصہ لینے کا حق۔
* فریق ممالک دیہی علاقوں کی عورتوں کے مسائل اور اپنے اپنے خاندان کی کفالت میں ان کے کردار کو مدنظر رکھیں گے اور اس کنونشن میں دی گئی مراعات کو ہر ممکن اقدامات کے ذریعے دیہی عورتوں پر بھی لاگو کریں گے۔
* معاشرے کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لینا۔
* تمام ترقیاتی پروگراموں سے فائدہ اُٹھانا۔
* صحت کی سہولتوں تک رسائی کا شعور اور منصوبہ بندی کے پروگراموں کے بارے میں آگاہی۔
* معاشرتی تحفظ کے تمام پروگراموں سے فائدہ اُٹھانا۔
* تکنیکی مہارت بہتر بنانے کے لیے تمام ضروری تعلیم اور تربیت حاصل کرنا جس میں سرکاری اور غیر سرکاری تعلیمی پروگرام، خواندگی کے پروگرام اور دیگر معاشرتی سہولتیں شامل ہیں۔
* اپنی مدد آپ کے تحت کوآپریٹو پروگراموں کے ذریعے ملازمت حاصل کرنا اور اقتصادی مواقعوں تک پہنچنا۔
* زرعی قرضوں، تکنیکی مہارت اور زرعی اصلاحات سے فائدہ اُٹھانے کے برابر مواقع۔
* حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق رہائشی سہولتوں کی فراہمی۔
* ریاستیں عورت اور مرد کی مساوی حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کریں گی۔

* ممالک خواتین کو مردوں کی طرح کاروبار میں معاہدہ، جائیداد کی خرید و فروخت اور عدالتوں اور ٹریبونل کے سامنے کیس لڑنے کے مساوی مواقع مہیا کریں گے۔
* کنونشن میں شریک ممالک اس بات پر متفق ہیں کہ ایسی تمام تر قانونی شقیں اور قوانین جو عورتوں کی قانونی حیثیت متاثر کرتی ہیں، ختم کردی جائیں گی۔ کنونشن میں شریک ممالک شادی اور سماجی رشتوں کے حوالے سے خواتین کو مردوں کے مساوی حقوق پہنچائیں گے۔ مثلاً:
* اپنی مرضی کی شادی کرنے کا حق۔
* اپنی مرضی کا لڑکا تلاش کر کے اپنی رضا سے شادی کرنے کا حق۔
* شادی کے عرصہ کے دوران اور اس کے خاتمے تک دونوں فریقوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔
* والدین کی حیثیت سے ایک جیسے حقوق اور فرائض جس میں بچے کا فائدہ سب سے اہم ہوگا۔
* بچوں کی تعداد اور ان کی پیدائش میں وقفے کے عرصہ کو متعین کرنے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ضروری اطلاعات حاصل کرنے کا حق۔
* بچوں کو متبنّیٰ سرپرستی دینا اور گود لینا جیسے تصورات جن جن ممالک میں بھی ایسے ادارے موجود ہیں وہاں بچوں کے استحقاق کو اولیت دی جائے گی۔
* ایک جیسے ذاتی جس میں مرد کی طرح عورت کو بھی خاندانی نام رکھنے اور من پسند ملازمت اور پیشہ اختیار کرنے کا حق دیا جائے گا۔
* شادی شدہ جوڑوں کو جائیداد کی خرید و فروخت، اس کا انتظام اس کو بیچنا یا بطور تحفہ دینے کا مساوی حق ہوگا۔
* بچوں کی شادی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ شادی کے لیے عمر کی حد تک

مقرر کی جائے گی اور شادی کو با قاعدہ رجسٹر کرانا لازمی ہوگا۔

* خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیاز کو ختم کرنے کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل۔
* ممالک کو کنونشن کے نفاذ پر ہر پانچ سال بعد ایک رپورٹ دینی ہے۔
* کمیٹی یو،این کی جنرل اسمبلی کو رپورٹ کرے گی۔

مگر، ضیا الحق نے آتے ہی ہر اچھی چیز کی دھجیاں اڑانی شروع کیں۔ اُس نے بہت تیزی سے اپنی کرم خوردہ اور تعفن زدہ پالیسیاں لاگو کرنی شروع کیں۔ 1979 میں اس نے سرکاری دفتروں میں مخصوص لباس پہننے کے احکامات جاری کیے۔ 1980 میں خواتین کو کھیلوں میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے عورتوں کی حیثیت کو بہت ادنیٰ اور حقیر قرار دیا جانے لگا۔ زندگی کے ہر شعبے میں دُوررس تبدیلیاں لائی جارہی تھیں۔ سیاسی غلبہ حاصل کرنے کے لیے روایات، عورتوں کے طرزِ زندگی، ان کے آزادی سے گھومنے، لباس، کام کرنے اور ان کی روحانی اور سماجی ذمہ داریوں کا استحصال کیا جارہا تھا۔

عورتوں کی بقا اور بہبود کے لیے ضیا کا فوجی نظام خطرے کا باعث بن گیا۔ چنانچہ عورتوں کے اندر اِن اقدامات کے خلاف غصہ پھیل گیا۔ اس نئے سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے کے خلاف مزاحمت کرنے کے لیے 1981 میں کراچی کے اندر خواتین محاذِ عمل (ویمن ایکشن فورم یا WAF) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس پلیٹ فارم میں تقریباً سات گروپ شامل تھے۔ ان ساتوں گروپوں نے اپنی آزادانہ اور الگ حیثیت برقرار رکھ کر ایک پاپولر فرنٹ اور متحدہ محاذ کی صورت میں WAF کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا۔ انھوں نے ایک ہی نکتہ اٹھایا: عورتوں کے لیے بنیادی انسانی حقوق کا حصول۔ ان حقوق میں تعلیم، روزگار، جان کی سلامتی، ازدواجی زندگی کا اختیار، منصوبہ بند اولاد۔ اسی طرح جنس کی بنیاد پر قائم سارے امتیازات کو ختم کرنا بھی اس کے پروگرام میں شامل تھا۔ مارشل لا کے خلاف WAF نے خوب خوب چھاپے مارے۔

WAF نے عورتوں کی ہاکی ٹیم پر باہر جانے کی پابندی کے خلاف مظاہرہ کیا۔ انھوں

عورتوں کی الگ یونیورسٹی کی مخالفت کی۔ اس نے حدود آرڈیننس کے خلاف ایک مہم چلائی۔ 1982 میں جب ذرائع ابلاغ کے اندر عورتوں پر پابندی لگادی گئی تو WAF نے اس بات کی مخالفت کی۔ اِدھر ڈاکٹر اسرار احمد نے ٹی وی پر جب یہ فتویٰ لگادیا کہ تمام عورتوں کو دفتروں کی ملازمت سے برخاست کیا جائے تو WAF نے ڈٹ کر اس پروگرام کو بالآخر بند کروادیا۔ عورتوں کی اس ساری جدوجہد میں سندھ کے مارشل لائی گورنر کی بیگم محترمہ یاسمین عباسی جیسی خواتین شامل رہیں۔ (فرعون کے گھر میں موسیٰ!!)۔

WAF نے مذہبی تعصب، فرقہ واریت، بنیاد پرستی اور لسانی جھگڑوں کے خلاف بھی جدوجہد کی۔ جب پاسپورٹ کے فارم پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو اس اقدام کی زبردست مذمت کی گئی۔ قومی شناختی کارڈ پر مذہبی کالم کے خلاف بھی اس تنظیم نے آواز اٹھائی۔ جب 1982 میں ایک مرد کی گواہی کو دو عورتوں کی گواہی کے برابر کرنے کی تجویز ہوئی تو WAF نے جلسے کیے، جلوس نکالے، لاٹھیاں اور آنسو گیس سہے۔ ایک اور آرڈیننس کے تحت قتل ہوجانے کی صورت میں عورت کو مرد کے مقابلے میں آدھا قرار دیا گیا۔ جس کے خلاف اپنی ناراضگی کی جدوجہد WAF نے جاری رکھی۔ اسی ایک ہی دوڑ میں 1983 کے اندر ضیا نے کسی انصاری کمیشن کی رپورٹ میں یہ سفارش کروائی کہ پچاس برس سے کم عمر کی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر قومی اسمبلی کی ممبر نہیں بن سکتی اور یہ بھی کہ عورت ریاست کی سربراہ نہیں ہوسکتی۔ تب بھی خواتین نے زبردست احتجاج کیا۔

WAF کی یہ تحریک بہت وسیع البنیاد تھی۔ بورژوا سیاسی پارٹیوں کی عورتیں بھی اس جدوجہد سے یک جہتی اور ہم دردی رکھتی تھیں۔ ترقی پسند سیاست کرنیوالے مرد وزن تو پہلے ہی ایسی تحریک کے خواہاں اور اس تحریک کے بانیوں میں سے ہوتے ہیں۔ کئی احباب نے لاٹھیاں کھائیں اور آنسو گیس کے مزے لوٹے۔ (مارشل لا کے خلاف جدوجہد میں انسان تروتازہ ہوجاتا ہے)۔

اس طرح اس جدوجہد سے عورتوں کی محکومی کا مسئلہ پہلی بار ہر شہر، گاؤں اور گلی و گھر کے اندر شناسائی پیدا کر گیا۔ یوں اپنے حقوق کی آواز بڑے زور سے اٹھانے کے علاوہ WAF نے بلاشبہ مارشل لا کو بہت اچھی طرح دکھی کردیا۔

1980 کی دہائی تک نہ صرف ہمارے خطے میں عورتوں کی تحریک اُٹھی بلکہ مشرق کے دیگر ممالک میں بھی عورتوں کی تحریک کا دائرہ کار ثقافتی سرگرمیوں کی صورت میں زبردست انداز میں نمودار ہوا۔ مصر میں مشہور خاتون ناول نگار نوال السعداوی، الجزائر میں علی نالم، مراکش میں لیلیٰ ابوزید، سینی گال میں سیمبین عثمان اور اردن میں بوثائینہ شعبان، جاپان میں ساوا کو آری یوشی، بنگال میں کلپنا بردھان اور تسلیمہ نسرین اور ہندوستان میں شوبھاڈے، کماری جے وردھنا اور دیگر لکھاریوں نے عورتوں کے مسائل پر زبردست ادب تخلیق کیا۔ پاکستان میں کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، ادا جعفری، نگہت حسن، یاسمین حمید، فریحہ ظفر، شہر بانو، ضیاء، ثمینہ رحمٰن، نگہت سید خان، رخسانہ احمد، روبینہ سہگل، درثمین احمد، زہرا نگاہ اور عشرت آفرین جیسی خواتین میدانِ ادب میں آئیں۔

WAF کو بعد میں تاڑ پیڈو کر کے دولخت کر دیا گیا۔ WAF کی لاہور شاخ میں بورژوا سیاسی عناصر کی زبردست نمائندگی موجود تھی۔ سیاسی طور پر ترقی یافتہ ممبر شپ بھی یہیں موجود تھی۔ اس لیے جھگڑا بھی لاہور کی تنظیم میں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بورژوا سیاسی پارٹیوں کے لوگ اصل تنظیم سے جدا ہو گئے اور انھوں نے WAF ڈیموکریٹک گروپ بنا لیا۔ اور اصل گروپ کا نام ہو گیا: WAF نیشنل۔ WAF تب سے ہوش میں نہ آیا، دوبارہ اُٹھ کھڑا نہ ہو سکا۔

''لبرل'' اور ''جمہوری'' بے نظیر جب تخت پر بیٹھی تو اس نے صرف وہی کام کیے جو آئی ایم ایف نے اُسے بتلائے تھے۔ بلا شبہ اس پسماندہ، اور رجعتی ملک میں عورت کا وزیراعظم بننا بذاتِ خود بہت بڑی بات تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ بیرونی دنیا میں پاکستان، اس کی پارلیمنٹ اور اس کی کابینہ ذرا سی وزن دار بھی ہو گئی۔ مگر بے نظیر بھٹو نہ تو پروگریسو خیالات کی نمائندہ ثابت ہوئی اور نہ ہی اس کی موجودگی سے عورتوں کے لیے رحم و کرم کی کوئی صورت نکلی۔ ویسے بھی سماجی، معاشی معاملات میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں کیے بغیر عورت کے لیے کسی بڑے پیمانے کی تبدیلی ممکن بھی نہ تھی۔ بے نظیر تو پھر اسی طبقاتی فیوڈل نظام کی نمائندہ سیاست دان تھی۔ فیوڈل نظام مردانہ بالا دستی والا نظام ہوتا ہے۔ لہٰذا بے نظیر سارا وقت عورتوں کے مسائل کو نظر انداز کرنے اور خود کو مردانہ وزیراعظم دکھانے کی جدوجہد کرتی رہی۔ حلف لیتے ہی بے نظیر کی باتوں اور کرتوتوں سے معلوم ہوا

کہ بے نظیر تو اسی قالب کی ڈھلی عورت ہے جس میں کہ مرد اور ملّا ڈھلے ہوئے ہیں۔ وہ انھی کی زبان میں بولتی تھی، اور انھی کے نظریات کو زنانہ آواز اور مرغن انگریزی لہجے میں پیش کر رہی تھی۔ (واقعی' بھٹو کی تصویر، بے نظیر بے نظیر)۔

وہ چوں کہ اپنے والد کے وسیلے سے سیاست میں حصہ لے رہی تھی' اس لیے وہ عورت کے روایتی رول پر ہی زور دیتی رہی۔ وہ عورتوں کو گرامر سکول کی ماسٹری، نرسنگ یا لاڑکانہ کی زنانہ پولیس تھانے کی حوالداری تک محدود رکھتی تھی۔ بے نظیر نے ماؤں کی تحریک منظّم کر کے ان کی آواز بلند کرنے سے ڈر کر دراصل خود اپنے اور عوام الناس کے بچوں کو گُنگ بنا ڈالا۔

لیکن اس پورے عرصہ میں جو اہم ترین کام ہوا وہ یہ تھا کہ پاکستان سرکار نے عورتوں کے حقوق کے عالمی معاہدے CEDAW پر دستخط کر دیے، جس پر ہم آگے چل کر بات کریں گے۔

جیسا کہ معلوم ہے فیوڈل ازم پبلک مقامات پر عورتوں کو آنے جانے نہیں دیتا۔ اور لہٰذا فیوڈل ازم عورتوں کو نہ صرف سیاسی عمل سے دور رکھتا ہے بلکہ انھیں، سیاسی اور انقلابی تحریک سے بھی دور رکھتا ہے۔ یہاں عورت پر پابندی اس لیے بھی زیادہ سخت و سنگین ہے کہ اسے غیرت کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح اس ناروا پابندی کو ایک ناپاک تقدس مل چکی ہے۔ بلوچستان میں عورت پر یہ پابندی اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ پابندی کم آبادی اور آبادیوں کے بہت دور دور واقع ہونے والی حالتوں کی ساتھی ہے، جو کہ آمد و رفت اور کمیونی کیشن کو ہر صورت میں مشکل بنا دیتی ہے۔(4)

بلوچستان میں لیڈر شپ کا سخت گیر ہیرارکی والا نظام' عورت کی حصہ داری کو بہت کم اہمیت دیتا ہے، فضیلہ عالیانی اور نور جہاں پانیزئی جیسی عورتیں تو استثنا اور حادثات تھیں۔ فضیلہ 1970 میں بلوچستان اسمبلی کی ریزروسیٹ پر نامزد کر دی گئی۔ بعد میں یہ دو تین خواتین بھی معدوم ہو گئیں اور سیاسی میدان سے بالکل ہی غائب کر دی گئیں۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ اصلی سیاسی پارٹیاں عورتوں کو ساتھ نہیں لیتیں، اور اسمبلی وغیرہ میں نظر آنے والی عورتوں کی کوئی پارٹی نہیں ہے۔

اسی دوران 1984 میں ڈیموکریٹک ویمنز ایسوسی ایشن نے اپنی شاخ بلوچستان میں قائم کی۔ اس

میں جمہوری سیاسی ورکرز اوران کی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں شامل تھیں۔اس ایسوسی ایشن کی اراکین کوئٹہ، سبی، اور کسانوں کے علاقے پٹ فیڈر میں تھیں۔ بدقسمت کولڈ وار کی فضا تھی۔ اُس میں ''اصلی پن'' کی دوڑ اور ''نمائندہ پن'' کے مقابلے میں بنیادی مشن بھی دھندلا پڑ جاتا تھا۔ چنانچہ عورتوں کی ڈیموکریٹک ایسوسی ایشن کو بھی بلوچستان میں انقلابی سیاسی پارٹیوں کی طرح کوئی بہت بڑا سیاسی میدان نصیب نہ ہوا اور یہ بے چاند والی سیاہ رات میں یک ساعتی چمک کے بعد تاریکی میں جذب ہو کر گم ہو گئی اور آج تک اس کی تنظیم، حسین تر ہو کر سامنے نہ آ سکی۔

حوالہ جات

1- ''نئے زاویے''، 1995، اثر گروپ، لاہور، صفحہ نمبر 69

2- مرنڈا ڈیز، ویمن اینڈ وائلنس، زیڈ بک، لندن، صفحہ نمبر 23

3- بوثائینہ...........صفحہ 132

4- فریدہ، آصمہ ضیاء اور سہیل وڑائچ، ویمن اِن پالیٹکس، مئی 1994، شرکت گاہ، لاہور، صفحہ نمبر 150

روایات، تواہمات اور ریاست

تیسری دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح بلوچستان میں بھی ڈائن اور چڑیلوں کا تصور ایک طویل عرصے سے موجود رہا ہے۔ ابھی نصف صدی قبل تک لوگوں کا خیال تھا کہ کچھ عورتیں ڈائن بن جاتی ہیں اور لوگوں کے دل نکال لیتی ہیں۔ آج بھی مریض کے پاس رات بھر جاگنا یعنی ''جاگرو'' کا تصور اسی لیے موجود ہے کہ مبادا عزیزوں رشتہ داروں کے خواب میں کوئی ڈائن آ جائے اور مریض (جو کمزوری کے باعث اپنا دفاع نہیں کرسکتا) کا دل نکال نہ لے۔ اس دل نکالنے کی صورت میں مریض محض ایک خالی ڈبہ رہ جاتا ہے اور کچھ ہی دن بعد مر جاتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ سخت بیماری میں مریض کے پاس ہمیشہ دو تین افراد (ترجیحاً مرد) جاگنے کی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ بڑا آدمی، معزز یا وڈیرہ ہو تو پھر تو پورا قبیلہ جمع ہو جاتا ہے اور رات بھر گوشت خوری، نڑسُر، رقص وسرور اور گپ شپ ہوتی ہے۔ تا کہ ڈائن گھس نہ سکے............اور ڈائن تو کیا اس محفل میں تو امریکی ڈرون بھی نہیں جھانک سکتے۔

اس عقیدے کے مطابق یہ ڈائن عورتیں کسی کی ماں، بیوی یا بہن ہوتی ہیں۔ یہ درمیانی عمر کی بھی ہوسکتی ہیں۔ اور ادھیڑ عمر کی بھی۔ (ویسے ہی غربت، بدصورتی اور ڈھلتی عمر جیتی جاگتی عورت کو ڈائن بنا دیتی ہیں)۔ ان عورتوں کے ساتھ بہت سی برائیاں منسوب کی جاتی تھیں۔ کھسر پھسر میں

لوگ ایک دوسرے کو ان سے خبردار رکھتے ہیں اور ان سے اور ان کے خاندانوں سے قطع تعلق کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔

لوگوں کا عقیدہ تھا کہ کچھ عورتیں شیطان کے ساتھ مباشرت کرتی ہیں۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ وہ بہت ہی گناہ گار ہوتی ہیں بلکہ شیطان کی طرف سے ودیعت کردہ ابلیسی قوتوں سے لبریز بھی۔ لہٰذا ان میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ ہوا میں پرواز کرتی ہوئی اپنے گھر سے سیکڑوں میل دور تک جاسکتی تھی۔ ان کی یہ اڑانیں راتوں کو ہوا کرتی تھی۔ وہ شیطان کی عبادت کرتی ہیں اور آدم خوری کے وظیفے پڑھتی ہیں اور گمراہ جنسی شہوت میں پڑتی ہیں۔

ان ڈائنوں کے پاس بے پناہ جادوئی طاقت ہوتی تھی۔ وہ بنی نوع انسان کی تباہی کے لیے شیطان سے ملی ہوتی تھیں۔ یہ ڈائنیں طوفان لاسکتی تھیں، فصلیں برباد کرسکتی تھیں اور کسی بھی مرد کو نامرد بنا سکتی تھیں۔ ڈائنیں مسلمانی کی صف سے خارج سمجھی جاتی تھیں۔

یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کہ بلوچستان میں ہوتا ہے۔ جہاں عورتیں سیکڑوں برسوں سے ہزار طرح کے دباؤ اور مصائب کے نتیجے میں مردوں کی بہ نسبت بہت توہم پرست بن چکی ہوتی ہیں۔ میرے وطن میں ایسا معاشرتی تانا بانا بُن دیا گیا ہے؛ جہاں عورت ان بندھنوں بندشوں کے دفاع کا نہ تو علمی استدلال رکھتی ہے اور نہ جسمانی قوت۔ لہٰذا مافوق الفطرت کی طرف رخ کرتی ہے۔ وہ پیروں کے درباروں میں جاتی ہیں، فریاد کرتی روتی ہیں۔ زندگی بدلنے نہیں بلکہ اپنے اوپر ظلم و جبر کرنے والے موجود سماج کو مضبوط تر کرنے کے لیے............بیٹا جننے یا شوہر کو زیادہ مہربان بنوانے کے لیے۔ تعویزیں لیتی ہیں، انھیں پانی میں گھول کر شوہر کو پلاتی ہیں، اس کے سرہانے کی بالشت میں سی دیتی ہیں۔ گھر کی دیوار کے شگافوں میں ڈال دیتی ہیں۔ ظاہر ہے نتیجہ صفر۔ عورت کے مرد کے خلاف سارے تعویزیں بے اثر ہوتے ہیں، ملّا ناکام اور مرشد بے اثر............سماجی دباؤ تب اُسے ہسٹیریا کی مریضہ بنا ڈالتا ہے۔ جسے بلوچی میں ''جن پکڑنا'' کہتے ہیں۔

یہ جن اُسے خصوصی مواقع پر پکڑتے ہیں، جمعہ کی رات کو، کسی تقریب اکٹھ میں یا شدید جذباتی وقوعہ پہ............ وہ بالکل مافوق الفطری مخلوق بن کر عجیب وغریب حرکتیں کرتی ہیں، گانے

گاتی ہیں، پیش گوئیاں بکتی ہیں اور بہت باتونی پن سے اپنا کتھارسز کرتی ہیں ۔جس وقت جن کسی عورت میں گھس جائے تو وہ زمین پر گر جاتی ہے، بے ہوش ہو جاتی ہے، اکڑ جاتی ہے ۔تڑپتی ہے، آنکھیں مضبوطی سے بند ہو جاتی ہے، دانت بھنچ جاتے ہیں۔ بہت دیر تک وہ ایک لفظ بھی نہیں بول پاتی۔اس کی بہنیں سہیلیاں فریاد کرتی ہیں، روتی ہیں، سبیلیں ڈھونڈتی ہیں، دکھی ہوتی ہیں مگر جن زدہ عورت کو گویا کوئی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ کچھ دیر بعد ہمارا ''ناٹرڈمی'' ملّا اپنے متشددانہ اسلحہ کے ساتھ مداخلت کرتا ہے تو وہی عورت کیا سے کیا کچھ اگل جاتی ہے!............اکیسویں صدی کی ایمرالڈ پہ تو باتونی گیری والا مرحلہ دراصل چار پانچ دن کے لیے اس کے دل کا غبار جھاڑ دیتا ہے اور اس کی روح ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔ ظالم ملّا ڈنڈے سے اسے پیٹتا ہے، اسے مرچیں جلا کر اسے تلخ ترین دھوئیں کی دھونی دیتا ہے۔ایسی ایسی شدت کے ساتھ تشدد کرتا ہے کہ سائنسی ایجادات ہیچ ہوتی ہیں ۔ پہلے شوہر، سسر، دیور یا بیٹا مارتا مارتا ہسٹیریا تک پہنچا دیتا ہے، پھر ملّا بدترین تشدد کر کے حیوانیت میں دھکیل دیتا ہے............ہمارا پورا سماج نفسیاتی مریض ہے۔

اس ''جنشوڑی'' (جن زدہ عورت) کے ساتھ دو قسم کے سلوک ہوتے ہیں؛ یا تو وہ گھرانے کے اندر بدبختی کی علامت بن جاتی ہے کہ دیگر با اولاد عورتیں بے بختی پھیل جانے کے خوف سے اس سے دور بھاگتی ہیں، اور وہ تنہائی کے صحرا میں پٹخ دی جاتی ہے۔اور یا پھر اس جنشوڑی عورت کو ایک درویش اور ولی کی صورت عطا کی جاتی ہے اور لوگ دعائیں کرانے اس کے پاس آنے جانے لگتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں خطرناک ہیں کہ انسان نارمل تصور نہیں ہوتا اور اس کی بیماری پکی ہو جاتی ہے ۔ جب جب مصیبتیں بڑھ جائیں عورت کو ہسٹیریا کے دورے پڑتے جاتے ہیں اور ملا کی ڈنڈے ماری کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

ان تمام تر توہمات سے نجات کے لیے، حتمی منزل صنفی مساوات ہے اور حتمی قافلہ سیاست ہے۔صنفی مساوات جو سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی تمام شعبوں میں متشکل و مستحکم ہو۔اور عوامی سیاست جو کمٹ منٹ پہ............مزدوروں کسانوں، چرواہوں ماہی گیروں اور عورتوں کی نجات کی کمٹ منٹ پہ مبنی ہو جس میں پدرسری نظام والی بحث مرکزی خیال ہو اور جہاں ریڈیکل

سٹرکچرل، معاشی اور سماجی چیلنج کے تقاضے سرفہرست جھلکتے ہوں۔ایسی طبقاتی سیاست جسے نہ وومن سٹڈیز میں اغوا کیا جاسکے، نہ این جی اوز اور اسٹیبلشمنٹ کی یاری کی بھینٹ چڑھایا جاسکے اور نہ ڈھائی وزارتوں سے dilute کیا جاسکے۔

عورتوں کی تحریک ایک cheap حرکت نہیں ہے۔اسے ہلکا سمجھنا، اس سے منافع بنانا، اسے شخصی اقتدار کا زینہ بنانا قہار کی کنجیوں کو چھونا ہے۔

مگر سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی اس تحریک نے بہت کچھ کرنا ہے۔منظّم ہونا اولین شرط ہے۔منظّم ہو پائے گی تو اُسے منشور آئین لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ میں نے اُن کا منشور جمع کر دیا ہے، سیکڑوں سالوں سے مسلط و مقبول کردہ وہ تمام نکات میں نے اکٹھے کیے جو عورت کے خلاف کہے گئے ہیں۔عورت تحریک کو بس اُن نکات کو باطل ثابت کرتے رہنا ہے۔لوگ منشور بناتے ہیں 'عمل درآمد' کرنے کو، میں انھیں منشور دے رہا ہوں اُس کے الٹ کام کرنے کو:

* اچھا ہے کہ عورتوں اور سانپوں کو زمین میں دفن کیا جائے۔دنیا بہتر ہو جائے گی اگر اسے ان کے وجود سے پاک کیا جائے۔(فردوسی، شاہنامہ)
* عورت فساد کی جڑ ہے۔
* عورت شیطان کی خالہ ہے۔
* دنیا میں سارے جھگڑے زر، زمین اور زن پہ ہوتے ہیں۔
* انگلستان کے مشہور مورخ ٹوئن بی کا دعوی ہے کہ انسانی تاریخ کی بہادری کے زمانے میں ساری تباہیاں عورت کے سبب آئی ہیں۔عورت ان تمام اسباب کی ذمہ دار تھی جس کے سبب ہیروؤں نے ایک دوسرے کو قتل کیا۔(1)
* پیٹو بیوی کو، ڈرے بہو۔ (بلوچی ضرب المثل)
* ابھی حال تک عالم گیر طور پر مانا جاتا تھا کہ مرد پیدائشی طور پر عورتوں سے زیادہ عقل مند ہوتے ہیں۔حتیٰ کہ سپنوزا جیسا روشن فکر شخص بھی اسی بنیاد پر عورت کو ووٹ کا حق دینے کی مخالفت کا فیصلہ کرتا ہے۔(2)

* بیوی، خاوند سے ہمیشہ قد میں چھوٹی ہوگی۔ (بلوچی کہاوت)

* افلاطون نے کہا تھا کہ وہ مرد جو اِس زندگی میں دانائی کو تلاش نہیں کریں گے، وہ دوبارہ عورت بنا کے پیدا کیے جائیں گے۔ ارسطو کہتا ہے کہ عورتوں کا خون مردوں کی بہ نسبت زیادہ کالا ہوتا ہے۔ عورتوں کے دانت مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔(3)

* تم مرد ہو، مرد اور گھوڑوں کے لیے کیا وطن؟۔ (بلوچی کلاسیکی شاعری)

* ''زھم جن۔ ڈاتار، سخی۔ مہمان نواز۔ بہادر'' مرد کے القابات ہیں۔

* لفظ'' بھڑ'' اگر مرد کے ساتھ لگا دیا جائے تو بالکل دوسرے معانی دیتا ہے، عورت کے ساتھ آئے تو بالکل الگ مطلب نکلتا ہے۔ مرد کے لیے یہ'' بہادر'' کے معنی دیتا ہے اور عورت کے ساتھ یہ لفظ سگھڑ، اور کام مشقت کرنے والا ہو جاتا ہے۔

* ''مئے چکاں''۔ (ہمارے بچے)۔ 80 سالہ بوڑھا اپنی بزرگ سن بیوی جو کہ بڑھیا ہے' کو کہتا ہے۔

* زال کہ گلّے کن انت گڑہ چون کن انت۔ (اگر عورت لشکر بنا بھی لے تو کیا کرے گی؟)

* عورت اور گھوڑی کا کوئی بھروسہ نہیں۔(4)

* رات کو بھیس بدلے بادشاہ کا گزر ہوا، ایک خیمہ بستی سے۔ باپ بچوں سے کہہ رہا تھا: ''جو شخص بیوی کو میکے بھیجے اور ساتھ نہ جائے وہ ذلیل شخص ہوگا۔ جو شخص سفر کو نکلے مگر پیسہ ساتھ نہ لے وہ ذلیل شخص ہوگا۔ جو شخص اپنا کام دوسرے کو بتائے وہ ذلیل شخص ہوگا۔

بادشاہ کو سخت تشویش ہوئی کہ اس کی اپنی ملکہ جو کہ پڑوسی بادشاہ کی بیٹی تھی، میکے گئی ہوئی تھی۔ اس نے خفیہ طور پر سسرال جانے کا فیصلہ کیا۔

اس نے اشرفیوں سے لدے چھ سات اونٹوں کا قافلہ ساتھ لیا اور پڑوسی سلطنت کی طرف نکل گیا۔ ساتھ والے جنگل میں قافلہ ٹھہرایا اور خود گداگروں کا بھیس بدل کر اُس بادشاہ کے دارالحکومت پہنچا۔ اور وہاں گھر گھر صدائیں دینے لگا۔ وہاں کہ دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی اپنے باپ کے ایک نوجوان وزیر کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آ رہی ہے۔ (بادشاہ کو افسوس ہوا کہ خیمے والا

شخص ٹھیک کہہ رہا تھا مجھے اپنی بیوی کے ساتھ آنا چاہیے تھا)۔ وزیر نے اُسے بھیک میں چاندی کی اشرفی دی۔ ذرا آگے بڑھا تو اس کی بیوی نے اپنے عاشق سے کہا کہ یہ عام بھکاری نہ تھا، مجھے لگتا ہے کہ یہ میرا خاوند تھا۔

وزیر نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ اسے گرفتار کر کے ساتھ والے جنگل میں لے جا کر قتل کیا جائے۔ اور ثبوت کے بطور اس کی آنکھیں نکال کر میرے پاس لاؤ۔ سپاہی گداگر کو پکڑ کر جنگل کی طرف لے گئے، جہاں بادشاہ کا قافلہ چھپا ہوا تھا۔ بادشاہ کو اندازہ ہوا کہ اس دانا شخص کی دوسری بات بھی صحیح ہے۔ وزیر کو مجھے قتل کرنے کی نگرانی خود کرنی چاہیے تھے، اس نے اپنا کام دوسروں کو بتا کر غلطی کی۔ اُسے اس کی تیسری نصیحت بھی یاد آئی کہ سفر پر جاؤ تو پیسہ ساتھ لو۔ اس نے راشی سپاہیوں کو اشرفیوں بھری ایک بوری دے دی، دنبہ ذبح کر کے سجی کھلا دی اور دنبہ کی آنکھیں نکال کر دے دیں کہ وزیر کو کہہ دیا کہ انھوں نے مجھے قتل کر دیا اور یہ میری آنکھیں ہیں۔ وہ زندہ سلامت اپنے وطن پہنچا اور بڑی فوج لے کر سسر کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اُس وزیر اور اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ (گیدی کسّہ)

* اے عورت تمہارا نام ہے، بے وفائی

* حال کہ زالا پجشہ

زاں کہ جہاں پوہ بیثہ

(جب خبر بیوی تک پہنچی، سمجھو پوری دنیا کو خبر ہوگئی)

* زالا کہ شاروئے کثے۔ بستیں شلی آ جا بہے۔

(عورتیں بھی اگر لشکر بنا لیتیں تو شلی جنگ کے لیے تیار ہوتی)

* مشہور شاعر ملٹن کا کلام:

خدا نے یہ عجوبہ، زمانے کا یہ نقص

زمین پہ کیوں پیدا کیا،

وہ یہ دنیا مرد اور فرشتوں

سے بھر نہیں سکتا تھا کیا،

یا اسے کوئی اور طریقہ سے انسان پیدا کرنا نہیں آتا تھا کیا؟!

* کمزوری تمہارا نام عورت ہے۔(شیکسپیئر)

* جس وقت قدرت مرد بنانے میں کامیاب نہیں ہوتی تو اسے عورت بنا دیتی ہے۔

(ارسطو)

* عورت کی جگہ اُس کا گھر ہے، اُسے اپنے شوہر کو اپنا آقا سمجھنا چاہیے۔ انھیں مذہبی تعلیم بھی ضرور دینی چاہیے۔ تاکہ ان میں شرم وحیا اور فرمانبرداری پیدا ہو، بیٹی کو اپنے باپ کا مذہب اور بیوی کو اپنے شوہر کا مذہب بے چون و چراں قبول کرنا چاہیے۔(روسو)

* جھنڈہ کنت سہریں سری آ

یہ بہتر تھا کہ تم دوپٹہ اوڑھ لیتے، زنانہ کپڑے پہنتے۔(5)

(بزدلی کا طعنہ جو بلوچ بلوچ کو دے سکتا ہے)۔ یہ ایسا ہے جیسے اردو والے بزدلی کے کسی فعل پر کہہ دیتے ہیں: چوڑیاں پہن لو۔

* دھاری دار گائے سے خیر نہ مانگو، ہنستی رہنے والی عورت سے خیر نہ مانگو۔ دھاری دار گائے جا کے خود کو گم کر دیتی ہے اور ہنسنے والی عورت کسی اور مرد سے تعلقات بنائے گی۔

(بلوچی ضرب المثل)

* جو مرد بیوی کی نصیحت پر چلے گا، اس کی چادر اس کی شلوار کے پیچھے ہوگی۔

(شلوارے پشتا شال بیت)

* مرد جب بیوی کو جی جی بولے گا تو بیوی خود کو بی بی سمجھتی ہے۔

(بلوچی ضرب المثل)

* مست گھوڑی اور خاموش بیوی، دل کا خون کر دیتی ہیں۔(بلوچی ضرب المثل)

* عورت کو راستے کے ایک طرف ہو کر چلنا چاہیے نہ کہ مردوں کے درمیان میں، تاکہ اختلاط لازم نہ آئے۔

* عورت مٹک مٹک کر نہ چلے۔

حوالہ جات

1۔مبارک علی، ڈاکٹر۔ تاریخ اور عورت، 1993 فکشن ہاؤس لاہور، صفحہ 16

2۔ The Basic Writings Of Bertrand Russel۔سائمن اینڈ شٹر، 1961، صفحہ 84

3۔ایضاً، صفحہ 91

4۔ٹالسٹائی، لیو۔ وفا کیسی کہاں کا عشق، 1991 روہتاس بکس ٹمپل روڈ لاہور، صفحہ 17

5۔Morag، صفحہ 44

موجودہ حالت

بلوچ سماج میں مجموعی طور پر ابھی تک عورتوں کے حقوق کی حمایت بالکل کتابی، احمقانہ، ناقابلِ عمل ، ناقابلِ فہم اور ناممکن گردانا جاتا ہے۔ عورتوں کے جمہوری حقوق کی بات کرنے والوں کو فیوڈل تضحیکی رکاوٹوں کے علاوہ اُن نعروں، فقروں اور تصورات کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے، جن سے پوری دنیا میں فیوڈل علاقوں کے میں موجود سیاسی یا سماجی ورکر کو سامنا ہوتا ہے۔

عورتوں کی حمایت بلوچ کے ہاں ابھی تک بالکل کتابی' ناقابلِ عمل اور ناقابلِ فہم سمجھی جاتی رہی ہے۔ پڑھے لکھے دانش ور بھی ایسے افراد کو ''سستی شہرت کا خواہش مند'' کہتے رہے ہیں۔ مگر پھر بھی مست توکلی کی شروع کردہ اس تحریک کی خاطر اپنے راگ کا الاپنا تو فرض ہے، وہ بھی بلند آواز کے ساتھ.......... یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ لوگ بھی کہتے ہیں اور باشعور عورتوں کا 70 فیصد بھی یہی کہتی ہے کہ اول تو انھیں سماج میں عورت کی پسماندگی کا پتہ ہی نہیں، دوسرا یہ کہ یہ سماج اور زمانہ دونوں مرد کے ہیں، عورت بے چاری کیا کرسکتی ہے؟ اس لیے عورتوں کے حقوق' آزادی و برابری سب بکواس، اور فضول باتیں ہیں۔..........اب کیا کیا جائے؟ ہم انسان ہیں، اکیسویں صدی کے لوگ ہیں۔ ہم دنیا میں اونچے آدرشوں اور بلند انسانی تعلیم و منازل سے بے خبر نہیں رہ سکتے اور نہ ہی عورتوں کی آزادی کی تحریک سے لاتعلق رہ سکتے ہیں۔ آزادی کی ہزاروں تعبیریں ہوسکتی ہیں مگر بلوچستان کی

عورت کے لیے ایسی آزادی کی ضرورت ہے کہ جس سے وہ ایک آزاد فرد کی حیثیت سے پہچانی جائے، اور آزاد فرد کی حیثیت سے چیزوں کو سمجھنے اور عمل کرنے کے قابل ہوسکے۔ اور یہ سورج طلوع ہو کر ہی رہے گا۔ قراۃ العین طاہرہ نے اپنے قاتل سے آخری بات کرتے ہوئے کہا تھا؛ ''تم جب چاہو مجھے قتل کرسکتے ہو' لیکن تم عورتوں کی آزادی کو نہیں دبا سکتے''۔

بلوچستان میں ''خواتین پینل'' بالکل ہی ایک نیا مظہر ہے۔ یہ بلوچ معاشرے کی اُن پڑھی لکھی اور باشعور عورتوں پر مشتمل تنظیم ہے جنھوں نے بلوچ قومی تحریک کا اُس کے سیاق وسباق کے ساتھ ادراک حاصل کیا۔ اس تنظیم نے باقاعدہ طور پر سیاسی کام کا آغاز 2005 میں کیا، جب بلوچستان میں ایک بار پھر فوج کشی شروع ہوئی۔ اور بلوچ سیاسی ورکروں کو اغوا کرنا شروع کیا گیا۔ اس سلسلے میں شکر بی بی ایڈووکیٹ کی سربراہی میں بلوچ خواتین پینل کی بنیاد رکھی گئی۔ آہستہ آہستہ اس میں خواتین شرکت کرتی رہیں اور پینل مزید مضبوط و فعال بنتا گیا۔ شکر بی بی کے علاوہ کریمہ، فریدہ، عندلیب اور شہناز خواتین تحریک کی روحِ رواں بن کر سامنے آئیں۔ بلوچ خواتین پینل کا قیامِ عمل میں لانے کا مقصد بلوچ خواتین میں سیاسی و قومی شعور اُجاگر کرنا تھا۔ اس تنظیم نے لاپتہ افراد کی بازیابی کے حوالے سے کام کا آغاز کیا۔ واضح رہے کہ بلوچستان میں ماورائے قانون گرفتاریوں اور گمشدگیوں کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے بے شمار لوگوں کو لاپتہ کردیا گیا۔ پینل نے ان افراد کی فہرستیں بنالیں اور احتجاج شروع کردیا۔ ان طریقوں میں 14 اگست 2007 میں بیس دنوں کا بھوک ہڑتالی کیمپ اور مظاہرے شامل تھے۔ انھوں نے ایک بار شہید غلام محمد بلوچ کو حکومتی اہلکاروں کے ہاتھوں اغوا کرنے کی مزاحمت کی۔ اسی طرح شہدائے تربت کے واقعہ کے بعد ایف سی کی لاٹھی چارج اور آنسو گیس شیلنگ کے باوجود اپنے احتجاج کو منظم انداز میں جاری رکھا۔

پینل، پارلیمانی جدوجہد کی بجائے مزاحمتی جدوجہد کا حامی ہے۔ کوئٹہ اور مکران میں اس تنظیم نے اپنی جڑیں پھیلائی ہیں۔ ظاہر ہے اسے سماجی طور پر ''قابلِ برداشت' حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی سرگرمیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اسی لیے پبلک میں یہ لوگ سختی سے پردہ کے بطور منہ ڈھانپتی ہیں۔

''خواتین پینل'' کے علاوہ دیگر تنظیموں (بی ایس او آزاد' بی این ایم، اور مری اتحاد) کے

سیاسی عمل میں بلوچ خواتین سرگرمی سے حصہ لینے لگی ہیں۔

2005 کو شروع ہونے والی جنگ میں بے شمار عورتوں نے رونگھٹے کھڑے کردینے والی قربانیاں دی ہیں۔ واحد قمبر کی ماں جس کا ایک ڈاکٹر بیٹا زندہ نہ رہا، اور دوسرا زخمی بیٹا (واحد قمبر) طویل عرصے سے جیلوں میں ناقابلِ بیاں جسمانی اور نفسیاتی تشدد سہتا رہا۔ مگر وہ ماں عزم و بہادری کا نمونہ بنی، دوسروں کا ہمت بڑھاتی رہی۔ ذاکر مجید کی ماں اور بہنیں بیٹے کی اغوا شدگی کے غم کو باقاعدہ ایک تحریک بنا کر بہت عرصے تک پریس کلب کے سامنے بھوک ہڑتالی کیمپ قائم کیے ہوئی رہیں۔ اسی طرح میر بالاچ خان مری، نواب اکبر خان بگٹی اور دیگر سیکڑوں شہیدوں کی بیگمات مائیں، بہنیں اور بیٹیاں جس ہمت وشجاعت کے ساتھ پہاڑ جیسے غم سہہ چکیں، اُس کی مثال ماضی قریب میں نہیں ملتی۔

ایک نئی تاریخی بات یہ ہوئی کہ گم گشتہ عزیزوں رشتے داروں کی تلاش، اور دنیا کو اِن گمشدگیوں سے باخبر کرنے بہت عرصہ تک کوئٹہ پریس کلب کے سامنے کیمپ لگانے کے بعد اِن خواتین نے لانگ مارچ کرنے کا پروگرام بنایا۔ کوئٹہ سے کراچی تک پیدل چلتی یہ عورتیں سردی گرمی بارش چھالوں تھکاوٹوں کے باوجود کراچی پہنچیں۔ پھر وہاں سے پورے سندھ کو پیدل چل کر عبور کیا اور وہاں ڈیرہ غازی خان سے پنجاب پیدل چلتے ہوئے اسلام آباد، پہنچیں۔ یہ شاید اس خطے کا سب سے بڑا لانگ مارچ تھا، اور عورتوں کا تو شاید، دنیا بھر کا سب سے طویل لانگ مارچ۔

یہی بہادر اور کمیٹڈ عورتیں خیر بخش مری کے تابوت کو ہزاروں کے مجمعے میں سے زبردستی قبضہ کر کے ہزار گنجی لے گئیں اور اسے کاہان میں خفیہ اور گم نام تدفین کرنے کی سازش کو کامیاب ہونے نہ دیا۔

خواتین پینل کی تنظیمی داخلی صورت کیا ہے، اس میں کون کون سے گروہ شامل ہیں، یا اس کے اپنے اندر کی گروہ بندی کی کیا صورت ہے، ہم نہیں جانتے۔ اس کی شکل وصورت مستقبل میں کیا ہوگی اس کا بھی اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اتنا ہے کہ یہ تنظیم بدترین حالات میں واقعتاً عوامی آدرشوں آرزوؤں کا مجسم نمونہ بنی رہی۔

سیاسی پارٹیاں اور خواتین

مرحوم اجمل خٹک صاحب کو پاکستان میں روشن خیال ترین شخص تصور کیا جاتا تھا۔ سیکڑوں سیاسی ورکر اُس کے معتقدین میں شامل رہے اور وہ بہت اصرار کے ساتھ اسے اصلی اور بڑا انقلابی ثابت کرتے رہے۔ وہ سوویت یونین کی آنکھوں کا تارا رہا اور افغان انقلابی حکومت کا مہمانِ خاص بنا رہا۔ اس نے سینٹ اور اخبارات میں اس وقت بہت نمایاں حیثیت حاصل کر لی جب اُس نے ایک خاتون کے قاتل، پشتون کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی۔ پشتون روایات اور غیرت کے گھسے پھٹے الفاظ کی لفاظی کر کے خٹک صاحب نے اس قتل کو جائز قرار دے دیا۔ حیرت ہے کہ اب بھی اُس کی پارٹی میں بے شمار ''کمیونسٹ'' شامل ہیں اور اب بھی اس کا دفاع کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ جب اُس کی پارٹی کا یہ حال ہو تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیپلز پارٹی یا دوسری ''انقلابی بنائی گئی'' بورژوا پارٹیوں کا کیا حال ہوگا۔

پاکستان کی تاریخ ہے کہ یہاں بہت سارے لیڈر فیوڈل ہیرارکی سے وابستہ ہیں۔ وہ سیاست میں بے شک سامراج دشمنی اور روشن خیالی کی باتیں کرتے رہیں مگر سماجی معاملات میں ہر روز ایسے کئی فیصلے کرتے رہتے ہیں جو بہت ہی رجعتی ہوتے ہیں۔ ورکر بے چارے اُن کی ان ساری عورت مخالف (لہٰذا انسان مخالف) سرگرمیوں کے لیے 'معروضی' جواز ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

دوسرا المیہ یہ ہے کہ ہماری تقریباً ساری سیاسی پارٹیاں شخصیات پہ چلتی ہیں اور اسی وجہ سے یہ پارٹیاں اپنے پارٹی پروگرام اور سیاسی منشور پہ کچھ زیادہ انحصار نہیں کرتیں۔

چوں کہ اخباری بیانات دینا اور اپنے ان بیانات سے پھر جانا لیڈروں کا روزمرہ کا معمول ہے لہٰذا ہم پارٹیوں کی تحریری دستاویزات سے رجوع کریں گے۔ سب سے بڑی اور معتبر دستاویز پارٹیوں کے منشور ہوتے ہیں۔ پارٹی منشور سیاسی پارٹیوں کے شعور کا مظہر ہوتے ہیں۔ نیز یہ پارٹیوں کی طرف سے ملک کی معاشی، سیاسی اور سماجی صورت حال کا جائزہ بھی ہوتے ہیں اور انھیں حل کرنے کی حکمت عملی بھی۔ مگر ایک احمق بھی جانتا ہے کہ پارٹی منشور و آئین محض کاغذ کے پرزے ہیں۔ پارٹیاں نہ اُن پر چلتی ہیں نہ اُن کی پاسداری کرتی ہیں، اور نہ انھیں سنجیدہ لیتی ہیں۔ مجھے آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور ''نیشنل'' پارٹیاں منشور لکھتی کیوں ہیں؟۔

یہ بات درست ہے کہ پاکستان کی تاریخ مارشل لاؤں کی تاریخ رہی ہے۔ اور ہر مارشل لا میں سیاسی پارٹیوں کی سرگرمیوں پر پابندیاں لگائی گئیں، سیاسی ورکروں اور لیڈروں کو بار بار جیل میں ڈال دیا گیا، کوڑے، شاہی قلعے اور پھانسیاں دی گئیں۔ مگر اس کے باوجود عورتوں کے مسائل اس قدر بڑے اور گھمبیر ہیں کہ کسی صورت نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔

ہمارے معاشرے میں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے مسائل حل کرنا مشکل ہی نہیں، پیچیدہ بھی ہے۔ مردوں کے آئینی، سیاسی اور سماجی مسائل پوری آبادی کے مسائل ہیں جن میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ مگر عورتوں کو درپیش کچھ مسائل خصوصی ہوتے ہیں اور بقیہ آبادی سے مختلف بھی۔ چوں کہ ہماری سوسائٹی ایک فیوڈل سوسائٹی ہے، اس لیے پسماندگی، قدامت پرستی اور رجعت پسندی ہمارے سماج کے اہم سماجی مظاہر ہیں جن کے تحت عورت سنگین مسائل کا شکار رہتی ہے۔ ظاہر ہے ان مسائل پر محض ایک آدھ فقرہ بولنا ان مسائل سے لاتعلقی کے مترادف ہے۔ اور یہ بات ہم بتا چکے ہیں کہ وہ سیاسی پارٹیاں جنھوں نے اپنے منشور میں ایک دو فقرے لکھے ہیں، وہ ان مسائل کو حل کرنے میں قطعاً سنجیدہ نہیں ہیں۔

مگر اس حقیقت کے باوجود کہ پارٹیاں منشوروں پہ عمل نہیں کرتیں، اور منشور محض

دکھاوے کے ہوتے ہیں، تشویش کی بات یہ ہے کہ ہماری اکثر پارٹیاں اس حقیقت پہ تو خوب لفاظی کرتی رہتی ہیں کہ عورتیں آبادی کا نصف ہیں مگر ان کے منشوروں میں عورتوں کے بارے میں آدھا صفحہ تک موجود نہیں ہوتا۔

ایک اور چیز جس پہ ہماری سیاسی پارٹیاں زبردست لفاظی کرتی رہتی ہیں، وہ اکیسویں صدی میں وقار اور عمدگی سے داخل ہونا ہے۔ لیکن انھی پارٹیوں کے منشور دیکھیں تو عورتوں کے حوالے سے ہماری یہ سیاسی پارٹیاں ماقبل تاریخ کے عہد میں جاتی نظر آتی ہیں۔

پاکستان میں عورتوں کے مسائل پہ بات کرنے کا مطلب ہی، سماج میں تبدیلی لانے کی خواہش ہوتی ہے۔ قبائلی سماج و کلچر میں عورتوں کی نجات کی بات کرنا اس استحصالی سماج کی بنیادیں ہلا ڈالنے والی بات ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری ساری سیاسی پارٹیاں ''سٹیٹس کو'' کی پارٹیاں ہیں۔ یہ نہ صرف فیوڈل نظام کی پیداوار ہیں بلکہ یہی اسے قائم رکھنے کی محافظ بھی ہیں۔ موجودہ استحصالی نظام، ہماری سیاسی پارٹیوں کی طبقاتی بقا اور بڑھوتری کے لیے لازمی ہے۔ اسی لیے ہماری پارٹیاں بہت خلوص کے ساتھ اسے سالم رکھنے کا کام کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ عورتوں کے حقوق کی بات نہیں کرتیں۔ اور اگر کرتی بھی ہیں تو چلتے چلاتے ہیں، بہت مختصر اور بہت غیر متعلقہ امور چھیڑتے ہیں۔

جمہوریت کا لفظ دہراتے رہنا بھی ایک داؤ پیچ، ایک حربہ ہے جسے ہماری سیاسی پارٹیاں اسی طرح تھوک کے حساب سے چپتی رہتی ہیں جس طرح کہ وہ بلوچستان میں لفظ ''بلوچ'' کو بے حساب استعمال کرتی رہتی ہیں۔ مگر ہم سب جانتے ہیں ان کا ''بلوچ'' سے مطلب بلوچ مرد ہوتا ہے، ان کا جمہوریت کا لفظ ''مرد کے لیے جمہوریت'' کے معانی رکھتا ہے۔ یہ پارٹیاں نہ تو بلوچستان حکومت میں ایک سیکرٹری کے بطور کسی عورت کو متعین کرتی ہیں، نہ یہ اسمبلی میں ایک آدھ عورت برداشت کرسکتی ہیں اور نہ ہی ایک عورت کو گورنر، سپیکر یا وزیر اعلیٰ ہوتے برداشت کرتی ہیں۔ آئین ساز اداروں اور انتظامی عہدوں سے پچاس فیصد کی نمائندگی اگر صفر کردی جائے تو جمہوریت بھی صفر، عورتوں کے حقوق بھی صفر اور فیوڈل نظام کا متبادل بھی صفر۔ مردانہ سماج میں مردانہ بالادستی کی

پارٹیاں ہیں، پاکستان کی ساری سیاسی پارٹیاں۔

پاکستان میں مادری زبانوں میں تعلیم دلانے کا مطالبہ ایک بہت ہی دیرینہ مطالبہ رہا ہے۔کمیونسٹوں،قوم پرستوں اور ماہرینِ تعلیم نے بالخصوص اس مطالبہ کو اپنے بنیادی نکات میں شامل کیے رکھا۔مگر زبان ابلاغ کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی، یہ تو مروجہ سماجی معاشی نظام کا آلۂ کار بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری قومی زبانوں کے سارے ضرب الامثال، ساری شاعری (کسی کسی مست توکلی اور کسی کسی شاہ لطیف وشاہ حسین کو نکال کر) اور سارے لوک قصے مردوں کے حق میں ہیں، ہمارا فوک عورت کی تذلیل کی حد تک عورت مخالف ہے۔ ہماری مادری زبانوں کو جدید تصورات سے بہت دور رکھا گیا ہے۔ ہماری زبانوں میں فکر اور تصور فرسودہ ہیں۔اور یہ فرسودگی فیوڈل نظام کے حق میں مدومعاون ثابت ہوتی ہے۔اس لیے مادری زبان کو بذریعہ تعلیم بنانے کی بات اُدھوری بات ہے۔ پوری بات یہ ہے کہ مادری زبان میں سائنسی تعلیم دینی چاہیے۔

ہماری پارٹیاں نہ صرف روایتی غیرت کے تصور کے اثر میں ہیں بلکہ وہ واقعی سمجھتی ہیں کہ عورت ذہنی وجسمانی ساخت اور صلاحیتوں کے حوالے سے مرد سے کمتر ہے؛ بیالوجی میں بھی،فلاسفی میں بھی۔ چنانچہ سارا Concept ہی بدلنا ہوگا۔عورتوں کے زخم پارٹی منشور میں ایک چھوٹے سے فقرے کی بہ نسبت بہت بڑے ہیں۔ جمہوریت، انقلاب، اور انسانیت کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی پارٹیاں عورتوں کے بارے میں ایک مکمل پیکیج دیں۔ جہاں لب سے لے کر سیاہ کاری تک، اور گھریلو ماحول سے لے کر پارلیمنٹ کی ممبری تک اس کی پوری زندگی کا احاطہ ہو سکے۔

ہم نے تقابلی جائزہ میں پاکستان کی مذہبی سیاسی پارٹیوں، پیپلز پارٹی اور اس کے دھڑوں، مسلم لیگ اور اس کی نونوں، قافوں نیز بلوچستان کی ساری قوم پرست پارٹیوں کے منشوروں کا مطالعہ کیا ہے اور نکتہ بہ نکتہ ان کا جائزہ لیا ہے۔ملاحظہ فرمائیے۔

بچیوں کی تعلیم

پاکستان میں ویسے ہی خواندگی اور تعلیم کا گھوڑا بہت ہی لاغر اور لنگ ہے مگر عورتوں کی تعلیم تو بالکل ناگفتہ بہ صورت میں ہے۔اور پھر بلوچستان میں تو یہ کسی طرح سے بھی ترجیحات میں شمار نہیں ہے۔ اس کی وجوہات صرف سماجی تہذیبی پابندیاں ہی نہیں ہیں بلکہ معاشی مجبوریاں بھی ہیں۔ میری حیرت کا انتہا تھی جب میں نے ساری بلوچستانی نیز ملک گیر پارٹیوں کے منشور کھنگالے اور وہاں اس کا تذکرہ تک نہ پایا۔

عورتوں کے لیے روزگار

اَن پڑھ عورتوں کے روزگار کو چھوڑیے، ہمارے سماج میں پڑھی لکھی عورتیں بھی بے روزگاری کے بے انت صحرا میں کھڑی ہیں۔وہ گھر کی بے نام مشقت اور باورچی خانہ کی بے کراں یکسانیت میں اپنی ساری صلاحیتیں اور عمریں بتادیتی ہیں۔ نہ انھیں ملازمت و روزگار کی ضمانت حاصل ہے اور نہ اُن کے لیے کم از کم اجرت کا تعین موجود ہے۔سرکاری، نیم سرکاری اور خود مختار اداروں میں عورتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کیا ملازمتیں دی جائیں گی، کم از کم 25,20 فیصد کا کوٹہ تو مقرر ہونا چاہیے۔مگر نہ سرکار بولتی ہے اور نہ سیاسی پارٹیاں توجہ دیتی ہیں۔

لب

چاروں صوبوں میں بالعموم اور فرنٹیئر، بالائی سندھ، جنوبی پنجاب اور مشرقی و وسطی بلوچستان میں بالخصوص بچیوں کی منگنیاں ''لب'' کے رواج کے تحت ہوتی ہیں۔اس کے تحت انھیں قیمتاً فروخت کر دیا جاتا ہے۔انسان فروشی کی یہ رسم نہ صرف انسانیت کی توہین ہے بلکہ اس کے تحت عورت انسان کی بجائے ایک خرید وفروخت والی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ اتنے بڑے اور بھیانک معاملے پر سیاسی پارٹیوں کی مکمل خاموشی ایک جرم ہے اور ہماری ساری سیاسی پارٹیاں اس جرم میں شریک ہیں۔

اسی طرح ''وٹے سٹے'' کی شادیاں ہیں، جہاں پھر عورتوں کو ایک آزاد شہری کی بجائے

ایسی اجناس کے زمرے میں لایا جاتا ہے جہاں مال کے بدلے مال کا نظریۂ عملی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح پرانی دشمنی کو ختم کرنے کی ضمانت کے بطور عورتیں دشمن گھرانوں میں بیاہی جاتی ہیں۔ چنانچہ ان ساری ناروا اور حرام شادیوں سے بچنے کا حل یہی ہے کہ شادی میں عورت کی اپنی رائے لازمی بنا دی جائے۔

اور، رائے صرف بالغ انسان ہی رکھ سکتا ہے۔ اسی لیے بچپن کی شادیوں پہ پابندی اور عورت کو مالِ تجارت قرار دینے کے تصور کی مخالفت کے اہم نکات پہ ساری سیاسی پارٹیاں خاموشی اختیار کیے بیٹھی ہیں۔

وراثت میں حصہ

مکران کے کچھ علاقوں کو چھوڑ کر باقی سارے بلوچ معاشرے میں لڑکی کو جائیداد میں کوئی حصہ نہیں دیا جاتا۔ یعنی اُسے اولاد میں تصور ہی نہیں کیا جاتا اور وراثت کے سارے حقوق صرف نرینہ اولاد کو حاصل ہیں۔ اس احساسِ محرومی کو عورت ساری زندگی اپنی نفسیات کا حصہ بنائے رکھتی ہے اور یہ گھاؤ اُسے سماجی زندگی میں بھی ساری عمر غیر محفوظ اور Dependent بنائے رکھتا ہے۔ اس مسئلے پر ہماری ساری ملکی و صوبائی سیاسی پارٹیاں اپنے منشوروں میں کچھ بھی نہیں کہتیں۔

گھریلو تشدد

نواز شریف والی مسلم لیگ نے اپنے منشور میں گھریلو تشدد، ہراساں کرنے اور عورتوں کی تضحیک کے خلاف ایک محفوظ ماحول فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ باقی سیاسی پارٹیوں کے نزدیک گھریلو تشدد، حراست میں تشدد، جنسی تشدد، پبلک بے حرمتی، عورتوں کو طوائف کے کاروبار میں جھونکنا گویا کوئی مسائل ہیں ہی نہیں۔ اور یار لوگ ان برائیوں کے خلاف نہ تو آئین سازی کرنے کی بات کرتے ہیں اور نہ ہی انتظامی بندوبست۔

سیاہ کاری

سماج میں عورت کے قتل کی یہ سپیشلسٹی معاشرے میں قابلِ گرفت جرم نہیں بلکہ ایک فخریہ عمل سمجھی جاتی ہے۔ اس پہ جس حساس ردِعمل کی ضرورت ہے، وہ پاکستان میں مفقود ہے۔ ہماری سیاسی پارٹیاں اسے کوئی اہم بات نہیں سمجھتیں۔ میں نے ایک بھی سیاسی پارٹی کے آئین و منشور میں اس لفظ کا تذکرہ تک نہیں پڑھا۔

سیاست میں شراکت

کسی بھی سیاسی پارٹی نے اپنے منشور میں نہیں لکھا کہ ان کی پارٹی کی لوکل کمیٹیوں، ضلعی اداروں اور صوبائی و مرکزی کمیٹیوں میں کتنے فیصد میں عورتوں کی کتنی فیصدی لازمی ہوگی' ان کے عہدوں میں عورتوں کا کیا تناسب ہوگا۔ یا وہ لوکل باڈیز میں، صوبائی اسمبلی، قومی اسمبلی اور سینٹ میں کتنے فیصد عورتوں کو ٹکٹ دے گی۔

ہمارے خیال میں پارٹی منشور میں اتنے بڑے بڑے مسائل پہ مکمل خاموشی یا چلتے چلاتے میں تذکرہ، انتہائی غیر ذمہ دارانہ بات ہے۔ یہ دراصل جاگیردارانہ رویہ ہے یا ماقبل جاگیرداری طرز، جس کے تحت سماجی، سیاسی مسائل پہ نہ بول کر یا بہت مختصر بول کر "سٹیٹس کو" کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

حاصلِ بحث

چنانچہ بلوچ عورت کی حالت پورے بلوچ معاشرے کی طرح' کسی بہت بڑی صورت میں تبدیل نہ ہوئی۔عورتوں کی سماجی حالت میں تبدیلی کے لیے تو سیاسی تحریک کی ضرورت ہوتی ہے، صنعت اور صنعت کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے پیمانے پر تعلیم اور بحث ومباحث کی ضرورت ہوتی ہے، مگر یہ سب باتیں بھر پور انداز میں کبھی میسر نہ ہوئیں۔ چنانچہ سماجی ڈھانچہ نہ بدلا۔وہی ماقبل فیوڈل رشتے جاری وساری رہے۔اگر مواقع ملتے اور ہماری عورت کو زبان مل جاتی تو یہ اپنی پسماندگی، دربدری اور بے چارگی کی دردبھری لمبی کتھائیں ضرور بیان کرتی جن سے دنیا ہل کر رہ جاتی۔ہمارے ہاں فرد کی مانند عورت تمام انسانی حقوق سے محروم ہے۔آج گلوبل گاؤں والی اس دنیا میں بھی ہمارا فیوڈل سماج ایک بند اور خفیہ سماج کی شکل میں موجود ہے اور زندگانی کے فطری سخت حالات اس کے اوپر کنکریٹ کی سخت تہیں جماتے رہتے ہیں۔ان تہہ درتہہ رکھے جانے والے سخت شیل میں سوراخ کر کے انسانی آزادی کا راستہ بنالینا بہت محنت کا کام ہے۔قبائلی فرد خود کو قبیلہ سے جدا نہیں کرسکتا اور اپنی مادی و روحانی زندگی کو اسی پر منحصر گردانتا ہے۔یہ سماج عورت کی آزادی اور برابری کی شاہراہ کی سب سے بڑی رکاوٹ کو خود (اپنی ماتحتی والی عادت، اپنے جمود کی حالت اور پرانے سماج کے مردہ بوجھ کو اُٹھائے رکھنے کی وجہ سے) بلند کرتا چلا جاتا ہے۔(1)

رفتہ رفتہ عورتوں کی تحریک اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بننے کی طرف روانہ ہوگئی۔عورتوں کے گروپ ادارے بننے لگے، عورتوں کے حقوق کے حامی اسٹیبلشمنٹ کے ممبر ہوگئے۔آج عورتوں کی تحریک خود اپنے اندر چیلنجوں کا کھلے انداز میں' لچک داری سے جواب نہیں دے پارہی' تاکہ یہ ترقی اور سیاست کے اعلیٰ درجے تک پہنچے۔ایک جمود سا ہے۔فنڈنگ اور نظریہ خلط ملط ہوگئے ہیں۔

تحریک کا مطلب کوئی ایک گروپ یا فورم نہیں ہوتا۔تحریک کی تو ایک منضبط نظریاتی بنیاد ہوتی ہے جو اس کی ساری کارروائیوں کی رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہوتی ہے اور اس کی پوزیشنوں کو واضح کرتی ہے۔جب سوچے سمجھے نظریاتی مؤقف پر مبنی حتمی اسٹریٹجی بنائی جاتی ہے تو یہ ایک تحریک بن جاتی ہے۔اور اس میں سیاسی' سماجی' شخصی اور ثقافتی عناصر شامل ہوتے ہیں۔

عورت کو آزادی لازماً دینی ہوگی۔ اس لیے کہ وہ صرف بچوں کی ماں نہیں ہے، محض زراعت کی ماں نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ وہ سماجی نظام کی تبدیلی کی ماں بھی ہے۔سماج کے اسی ستون کو اگر ٹارچر کیا جائے، نظر انداز کیا جائے تو سماج کی حالت بھلا کیا سدھرے گی؟۔

عورتوں کے حقوق کے بارے میں صرف مرد کو باشعور ہونا نہیں پڑے گا بلکہ لازم ہے کہ عورت بھی اپنی حقیقت کے بارے میں باشعور ہوجائے۔خاندان کے اندر اپنے استحصال اور سماج کے اندر اپنی محکومی کا شعور حاصل کرلے۔اس کے بعد مردوں کے ساتھ مل کر اس حالت کو بدلنے کے لیے شعوری قدم اُٹھانے کا رادہ باندھے۔ یہ لازم ہے کہ وہ گھر کے اندر مرد کی ماتحتی کے خلاف، خاندان کی طرف سے استحصال ہونے کے خلاف' کام میں' سماج' ملک اور عقیدہ کی دنیا میں' اپنے دوسرے درجے کا شہری ہونے کے خلاف' مالی پیداوار اور زچگی کے دوہرے بوجھ کے بارے میں خود کو شعور کے ہتھیار سے لیس کردے۔یہ شعور ظاہر ہے کہ علم کے بنا نہیں آسکتا۔اسی لیے تو عورت کی آزادی کی ایک لازمی اور بنیادی شرط' اس کا تعلیم یافتہ ہونا ہے۔ خواندہ عورتیں نہ صرف خود آزاد ہوسکتی ہیں بلکہ وہ پورے سماج کو خواندہ اور سلیم انسان، بخش سکتی ہے۔وکٹر ہیوگو نے کہا تھا کہ انسان کے اوپر ایک وحشی کی حاکمیت ہے، جس کا نام جہالت ہے۔یہ وہ وحشی ہے جس نے شہنشاہیت پیدا کی اور شہنشاہیت وہ اتھارٹی ہے جو جھوٹ اور دروغ پر کھڑی ہے۔(2)

تعلیم محض ''الف''، ''ب'' سیکھنے کا نام نہیں ہے۔ نہ ہی تعلیم یونیورسٹی سے نقل اور سفارش سے ڈگریاں لینے کا نام ہے بلکہ تعلیم تو ایسی ہو جہاں عورت زندگی کے ہر پہلو میں حصہ لیتی ہوئی نظر آئے۔ تعلیم وہ ہوتی ہے جس کے حصول سے ہم میں اچھی مہذب عادتیں پروان چڑھ سکیں۔ مثلاً صفائی، سچائی، ایمانداری، ہمدردی اور ایک دوسرے سے تعاون۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں یہ دیکھا جا سکے کہ مرد و زن، ذمہ داری اور فیصلے مل کر کیا کریں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ بچیوں کی تعلیم کے بارے میں کوئی تعصب، کوئی کھوٹ نہ رہ جائے۔

ہم یہ ساری بات اِس حقیقت کے باوجود کہہ رہے ہیں کہ بلوچستان میں ''متجسس و Suspicious'' قوتیں ''الف''، ''ب'' تک سیکھنے نہیں دیتیں۔ ابھی حال ہی میں پنجگور میں فرقہ واریت کی آڑ میں سکولوں کو بم دھماکوں کا نشانہ بنایا گیا اور سکول بند کر دیے گئے۔ عام ''الف بے'' والے سکول۔ وہ تو شاباش ہو وہاں کی منور اذہان والی خواتین اور مردوں کا جو سیکڑوں کی تعداد میں گھروں سے نکلیں، جلسہ جلوس کیا اور مصنوعی ''بم خوف'' سے آبادی کو نجات دلا کر اپنے سکول زبردستی کھلوا لیے۔

اسی طرح عورتوں کو ہنر سکھانے کی کوشش عورتوں کی آزادی کی تحریک کا خاص اور اہم کام ہے۔ عورتوں کو مالی طور پر آزاد کرنا اصل میں ان کی سیاسی، سماجی آزادی کی بنیاد اور ضمانت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

عورت کی محنت کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کا گھریلو کام ناپا، تولا اور محسوس کیا جانا چاہیے۔ اگر عورت کی محنت، (بالخصوص گھر کے اندر کا کام) تسلیم کیا جائے تو وہ ایک پیداواری انسان سمجھی جائے گی۔ جس وقت اس کے گھر کے اندر کی محنت کو تسلیم کیا جائے گا، تب ہی اس کے شرائط کار اور حالات کار میں آسانی اور سہولتوں کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ لینن نے جو یہ کہا تھا کہ ''عورت اپنی زندگی کا 3/4 واں حصہ بدبودار کچن کے اندر ضائع کرتی ہے'' (3) تو بلوچ معاشرے میں بھی کچن کی موجودگی اور اس کے وجود کا تسلیم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ تب ہی ان ''گھریلو غلاموں'' کے گھر کے لیے بجلی کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے تاکہ اس کا گھر روشن ہو' گرمیوں میں ٹھنڈا' سردیوں میں گرم ہو۔

ان کے کھانے پینے کی چیزیں فریج اور فریزروں میں محفوظ رکھی جا سکیں اور اوون ان کی خدمت کر سکے۔ بجلی اور اس کی برکت سے چلنے والے آلات عورتوں کو بہت سی مشکلات سے نجات دلاتے ہیں۔ کھانے بہت آسانی اور سادگی سے بنتے ہیں۔ پکانا تو ویسے ہی عورت کا مقدر ہوتا ہے۔ بوثائنہ نے کتنی سچی بات کہہ دی کہ ''اگر تم ٹالسٹائی بھی بنو اور اپنا شاہکار بھی لکھ رہی ہو اور اگر مہمان آجائیں تو سب کچھ لپیٹ کر ان کی خاطر تواضع کے لیے باورچی خانے جانا پڑتا ہے''۔

عورتوں کے لیے یکساں اور بور کرنے والی مشقت سے صرف ٹائم بچانا ضروری نہیں بلکہ اس بچائے ہوئے وقت کو اچھی طرح گزارنا بھی ضروری ہے۔ اس کے لیے تفریحی مقامات کا بندوبست کرنا' کھیلوں کی سہولتیں دینا' اور تہذیب و تمدن کی نعمتوں کے دروازے کھولنا ضروری ہے۔ اس کے لیے تعلیم کے بعد ٹریننگ سنٹر قائم کرنا اور انھیں ملازمتیں فراہم کرنا ضروری ہے۔ کارخانے بنا کر ان کے اندر عورتوں کو بھرتی کرنے کے بڑے فوائد ہیں۔ ایک بہت بڑے فلاسفر نے بتایا کہ بڑی صنعت عورتوں کو آزاد کرتی ہے اور کارخانے کے اندر کام کرنے سے ان کی ذہنی وسعت بڑھ جاتی ہے، وہ زیادہ سولائزڈ اور آزاد ہو جاتی ہیں' جن سے ان کی قبائلی زندگی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ (4)۔ ویسے بھی زمین کی پیداوار کا سرمایہ بننا، صنعت کاری کا وسیع ہونا، نابرابر ترقی کی قومی و بین الاقوامی صورت، اور نئے طبقوں اور ان کے اندر نئے تضادات سماج میں عورتوں کی پوزیشن اور حصہ داری پر بڑے اثرات لاتا ہے۔ کثیر ازدواجی کی لعنت گم ہو جاتی ہے۔

ہمیں عورتوں کو ملازمتیں دینے کے ساتھ ساتھ انھیں برابر کی اجرت دینے کا مطالبہ بھی کرنا ہوگا۔ عورتوں کے خلاف تشدد، زنا اور میڈیا میں عورتوں کی منفی نمائش کے خلاف کام کرنا ہوگا۔ عورتوں کے لیے مردوں کے برابر کے حقوق لینا ان کی تحریک کی حتمی منزل ہے۔ مگر یہ برابری کوئی میکانکی برابری بالکل نہ ہوگی جو ہمیں پاکستانی فلموں یا ڈراموں میں دکھائی جاتی ہے۔ آزاد عورت صرف وہی نہیں جو شراب پیتی ہو، سگریٹ پیتی ہو، پتلون پہنے، یا منی سکرٹ پہنے۔ (عورت دشمن لوگوں کے برعکس ہم ان چیزوں سے کسی کو محض اس لیے منع نہیں کرتے کہ اس کی جنس کیا ہے مگر ہم ''محض'' ان چیزوں کو آزادی نہیں کہتے)۔ عورت کی نجات کی ساعت وہ ہے جس میں وہ سچی ستھری

آزادی میں حصہ لے اور اپنے شعوری فیصلے خود کر سکے اور ان کا اظہار کر سکے۔ یہ تو معلوم بات ہے کہ ظالم و مظلوم کے درمیان' استحصال کرنے والے اور' استحصال ہونے والے کے درمیان اس موجودہ سماج میں ''برابری و مساوات'' نہ تھی' اور نہ ہی یہ ایک سخت اور صبر آزما جدوجہد کے بغیر ہو سکے گی۔

ہمیں معلوم ہے کہ جب کوئٹہ کے مضافات اور مستنگ میں سودا سلف خریدنے والی عورتوں پہ تیزاب پھینک دیا جاتا ہے تو معاشرہ بہت بڑا ردِ عمل نہیں کرتا۔ ہمیں فیوڈل سوچ نے اتنی چالاکی سے ''آزادی'' نامی یک نکاتی ایجنڈہ میں ڈال دیا کہ ہمارے عوام اپنے داخلی سماجی تضادات سے Sensitized ہی نہ رہے۔ عورت کی نجات کے بغیر، اُس کی شعوری تعاون کے بغیر ہمارا معاشرہ کس طرح آگے بڑھ سکے گا۔

عورت کو حق دینے کا مسئلہ اصل میں تہذیب کو حق دینے کے برابر ہے۔ کیوں کہ جوں جوں عورت اپنے حقوق دوبارہ حاصل کرتے ہوئے مستحکم ہوتی جاتی ہے، اسی قدر تہذیب حسین تر اور مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ ایک سائنسی اور کلچرل بنیاد عورتوں کو فطرت اور سماج کے ساتھ اپنے تعلق کو اچھی طرح سمجھنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اور اسے نفسیاتی طور پر مفلوج اور اپاہج بنانے والی توہمات والے مفروضوں کو ختم کرتی ہے (5)۔ جس وقت پیداواری وسائل سماج کی ملکیت میں آجائیں گے تو اجرتی محنت اور معاوضے پر کام کرنے والے طبقے بھی ختم ہو جائیں گے۔ اور ساتھ ساتھ، اس بات کی ضرورت بھی باقی نہ رہے گی کہ چند عورتیں پیسے کی خاطر خود کو مردوں کے حوالے کریں۔ عصمت فروشی گم ہو جائے گی۔ یک زوجگی کو نہ صرف یہ کہ زوال نہ ہوگا بلکہ وہ بالآخر ایک حقیقت بن جائے گی۔(6)

بلوچستان میں عورتوں کی تحریک کو خاندانی تعلقات کے مثبت رشتوں کے برقرار رکھنے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ مشترکہ اور مضبوط خاندان تو ایک نعمت ہے، بشرطیکہ قربانی صرف عورت کے حصے میں نہ آئے۔ یورپ کی عورت اس تحفظ سے محروم ہو گئی ہے۔ ہم اگر سماج میں موجود اس ہم دردی' ہم کاری اور تحفظ کو ترک کر دیں تو یہ ایک ارمان اور دکھی کرنے والی بات ہوگی۔ مگر پھر بھی

سب سے اچھی فیملی تو وہ نجات یافتہ لوگ بنائیں گے جو انسان کو رنگ نسل زبان اور جنس کے امتیاز کی عینک سے نہیں دیکھتے۔ اس لیے کہ ان کی روحوں میں پاکیزگی ہوتی ہے اور ''ان کے پاس موسم زدہ پوستین بھی ہیں اور گرم دل بھی''۔(7)

جب تک عورت سیاسی زندگی میں آزادی کے ساتھ حصہ نہ لے، جب تک عورت روزمرہ امور میں شریک نہ ہو، وہ نہ تو ترقی کر سکتی ہے، نہ کوئی تبدیلی لا سکتی ہے اور نہ ہی مکمل و مضبوط جمہوریت کی بات کر سکتی ہے۔(8)۔ سماجی عمل میں حصہ لیتے ہوئے اسے معذرت خواہی والی عادت ترک کرنی ہوگی۔ اور اسے اپنی آزادی کی اس طرح حفاظت کرنی ہوگی جس طرح باز اپنے بچوں کی حفاظت خبرداری سے کرتا ہے۔

عورت کی یہ ڈیوٹی انفرادی آزادی کے لیے نہیں ہے۔ عورت دوسری مظلوم اور دکھی مخلوق کے ساتھ مل کر اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر سکتی ہے۔ عورتوں کی حالت کی تبدیلی سارے سماج کے بدلنے کی جدوجہد کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ بزگر' چرواہا' مزدور اور دیگر زیردست طبقات بھی اپنی جدوجہد کو عورتوں کی نجات کی جدوجہد کے ساتھ لازماً شامل کرتے ہیں۔ یہ اتحاد سخت ضروری ہے۔ عورتوں کی جدوجہد کے لباس اور بھیس میں بہت سارے لوگ ہمیشہ ایک نظریاتی ملغوبہ، ایک مکسچر اور ایک کنفیوژن ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مردوں کے ساتھ موجود تضاد کو ایک ایسے طریقے سے پیش کرتے ہیں کہ استحصال شدہ مرد اور عورت باہم بٹ جائیں اور وہ استحصال کرنے والے معاشرے کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ وہ یا تو عورتوں کی جدوجہد کو اس کے فطری اتحادی یعنی مزدور اور کسانوں کی جدوجہد کی تحریک سے کاٹ ڈالتے ہیں، یا پھر اس طرح کے دوسرے لیت پیت کرتے ہیں جن کے نتیجے میں ایسا ماحول بن جاتا ہے جہاں لوگ مرد و زن کے درمیان برابری کو میکانکی والی برابری سمجھنے لگتے ہیں۔ یعنی مرد و زن بالکل ایک ہی طرح سے کام کریں اور گھریلو کام کو میکانکی انداز میں تقسیم کریں۔ یہ عورتوں کو ورغلانا ہے۔ عورتوں کی تحریک ان باتوں سے بہت بلند، بہت پاک و صاف تحریک ہوتی ہے۔ اصل منزل موجودہ ڈھانچہ میں مردوں اور عورتوں میں صرف مساوات حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ آگے بڑھنا ہے۔ اور ان تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ہے

جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کے تابع ہو جاتا ہے اور جس میں ایک جنس کا دوسری جنس پر انحصار ہو جاتا ہے۔

عورتوں کا مسئلہ سماجی ہے۔ ایسے تمام لوگ جو عورت کا مسئلہ مکمل طور پر حل کرنا چاہتے ہیں، انھیں تمام انسانوں کے مفاد کے لیے پورے سماجی مسئلے کو اپنا مقصد قرار دینا چاہیے۔ انسانی بہبود اور مساوی مواقع کی تحریک فرقہ بازی کی تحریک قطعاً نہیں ہے۔ چوں کہ سماجی آزادی اور صنفی برابری کے بغیر انسانی آزادی ناممکن ہے اس لیے انسانی آزادی کی جدوجہد کے قافلے میں عورتوں کی تحریک مزدوروں اور کسانوں کی تحریک کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ ان سب کی ایکتا پوری تحریک کی فتح مندی کی ضامن ہے اور یہ تحریک سماجی انصاف کی تحریک ہے۔

عورت کے حقوق کے لیے جدوجہد نہ تو خیراتی کام ہے، نہ یہ محض انسانی ہمدردی اور نہ ہی ترس خوری ہے۔ عورت کی آزادی کا معاملہ کسی خطے میں رہنے والی بہت بڑی اکثریت کی جمہوری اور معاشی آزادیوں کا معاملہ ہے۔

سموراماشیل نے کہا تھا؛''صرف آدھی گھاس کاٹنے سے باقی ماندہ آدھی گھاس سے مزید گھاس اگنے کو کوئی روک نہیں سکتا''۔(9)

حوالہ جات

1- سموراماشل............صفحہ نمبر 25

2- وکٹر ہیوگو، Les Miserables، صفحہ 58

3- لینن۔و۔ا۔''عورتوں کی نجات''، 1975، دارالاشاعت، ماسکو، صفحہ 30

4- کروپسکایا، لینن کی کتاب؛''عورتوں کی نجات'' کے پیش لفظ میں

5- سموراماشیل............صفحہ 23

6- اینگلز، فریڈرک''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز''، صفحہ 103

7۔ پبلو نرودا، Memoires، صفحہ 109

8- لینن، ولادیمیر، Collected Works، جلد 31

9- سموراماشیل''عورت اور انقلاب'' 1975، تیسری دنیا اشاعت گھر، کراچی، صفحہ 8